دسمبر ۲۰۰۴ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

عام طور پر ہمارے یہاں

توحید علمی و نظری —— یعنی —— توحید فی العقیدہ

پر تو بہت زور دیا جاتا ہے' لیکن

توحیدِ عملی

پر کما حقہ توجہ نہیں دی جاتی

ڈاکٹر اسرار احمد

پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ زمر —— تا —— سورۃ شوریٰ پر تدبر کے دوران

توحیدِ عملی کے انفرادی اور اجتماعی تقاضوں

یعنی: **اخلاص فی العبادت** اور **اقامت دین کی فرضیت**

کو خوب منکشف بھی فرمایا اور بیان کی توفیق بھی مرحمت فرمائی' اور

شیخ جمیل الرحمٰن مرحوم کی محنت نے ان خطابات کو کتابی صورت دے دی

اب کمپیوٹر کمپوزنگ پر' نئے گٹ اپ کے ساتھ' نظر ثانی شدہ ایڈیشن

قیمت اشاعت خاص: 100 روپے ' اشاعتِ عام: 60 روپے

شائع کردہ :

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 03-5869501

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد: 53

شمارہ: 12

شوال المکرّم 1425ھ

دسمبر 2004ء

فی شمارہ -/15

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مجلس ادارت

حافظ عاکف سعید

سید قاسم محمود

حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون

- اندرون ملک 150 روپے
- ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ 800 روپے
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ 1000 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700، فون 03-5869501

فیکس: 5834000 ای میل: anjuman@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور

فون: 6316638-6366638 فیکس: 6305110

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

☼ تذکرہ و تبصرہ ____________ 3

بین الاقوامی اور ملکی حالات

کے بارے میں ہمارا تجزیہ اور لائحہ عمل

حافظ عاکف سعید

☼ مطالعہ قرآن حکیم ____________ 33

مرتبہ صدیقیت اور سیرتِ صدیقیؓ —— آئینہ قرآنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

☼ دعوت فکر ____________ 51

تہذیبی کشمکش اور مسلم نفسیات — سید قاسم محمود

☼ دعوت و تحریک ____________ 60

خدمت خلق اور اسلامی انقلاب کا باہمی تعلق

مختار حسین فاروقی

☼ منہاج المسلم (۴۰) ____________ 67

مسلمان کا طرزِ حیات — علامہ ابوبکر جابر الجزائری

☼ تذکیر و موعظت ____________ 77

اسلامی اقدار — سید وصی مظہر ندوی

حیاتِ دنیوی۔ایک انمول تحفہ — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

☼ خطوط و نکات ____________ 87

''اقامت دین کی جدوجہد فرضِ عین ہے!''

چند اشکالات اور ان کے جوابات

☼ جدید دنیائے اسلام ____________ 91

برکینا فاسو

سید قاسم محمود

❀ ❀ ❀

بین الاقوامی اور ملکی حالات

کے بارے میں

ہمارا تجزیہ اور لائحہ عمل

امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید

کا سالانہ اجتماع ۲۰۰۴ء کے موقع پر خطابِ جمعہ

نحمدہٗ ونصلی علٰی رسولہِ الکریم ...... امّا بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ۔ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۴۱﴾﴾ (الروم)

﴿وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾﴾ (البقرۃ)

﴿وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ﴿۷﴾ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ﴿۸﴾ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ﴿۹﴾﴾ (الرحمٰن)

ادعیہ ماثورہ کے بعد:

حضرات محترم! میری گفتگو کا موضوع ہے ''بین الاقوامی اور ملکی حالات کے بارے میں ہمارا (یعنی تنظیم اسلامی کا) تجزیہ اور ہمارا لائحہ عمل''۔ تنظیم اسلامی کا یہ تجزیہ الحمد للہ قرآن و حدیث کی محکم اساسات پر مبنی ہے۔ چونکہ ہمارے لئے فکری و عملی راہنمائی کا اصل منبع و سرچشمہ قرآن حکیم ہے' جو الھدیٰ ہے' لٰہذا اپنا فلسفہ بگھارنے کی

بجائے ہمیں ہر معاملے میں قرآن کی جانب اور حدیث وسنت کی جانب' جو اسی قرآن مجید کی شرح و وضاحت ہے' رجوع کرنا ہوگا۔ میں نے اپنی گفتگو کو نکات کی شکل میں مرتب کیا ہے جس کے کچھ پہلو فکری اور علمی نوعیت کے ہیں اور کچھ حالات کے تجزیئے سے متعلق ہیں۔

موجودہ عالمی حالات پر الفاظِ قرآنی کا انطباق

پوری دنیا کے اِس وقت کے حالات پر سورۃ الروم کی آیت ۴۱ جتنی آج صادق آتی ہے تاریخ انسانی میں پہلے کبھی ایسا نہیں تھا۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ﴾

''خشکی اور تری (بحر و بر) میں فساد و بگاڑ پیدا ہو گیا ہے لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے''۔ یعنی یہ کوئی اللہ کی طرف سے انسانوں کے اوپر ظلم نہیں ہے' بلکہ یہ لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی کا نتیجہ ہے۔ یہ ان کی اپنی بداعمالیاں اور سیاہ کاریاں ہیں جن کے نتائج اس وقت بر و بحر میں فساد کی شکل میں ظاہر ہیں۔ ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمادیا کہ: ﴿لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٤١﴾﴾ ''تا کہ اللہ تعالیٰ مزا چکھائے ان کو اُن کے بعض اعمال کا' شاید کہ وہ لوٹ آئیں (بداعمالیوں سے باز آجائیں)''۔ یعنی یہ انسانوں کے جرائم کی کُل سزا نہیں ہے' بلکہ ان کے بعض اعمالِ بد کی کچھ سزا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہمارے سامنے قرآن میں جو فلسفۂ حیات واضح فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ یہ دنیا تو محض دار العمل اور دار الامتحان ہے' دار الجزاء نہیں ہے۔ دار الجزاء تو آخرت ہے' یومِ حساب اور یوم التغابن وہ ہے' ہار اور جیت کا فیصلہ اُس دن ہوگا۔ یہاں تو انسان کو امتحان میں ڈال کر موقع دیا گیا ہے کہ وہ اپنی قدر و قیمت (worth) ظاہر کرے۔ دیکھنا یہ مقصود ہے کہ ﴿اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا﴾ ''آیا وہ اللہ کا شکرگزار بنتا ہے یا ناشکرا و نافرمان''۔ لیکن یہ بھی اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ وہ کچھ اجتماعی جرائم کی سزا دنیا میں بھی مسلط کرتا ہے۔ جیسا کہ آیت کے اس ٹکڑے سے ظاہر ہے کہ

﴿لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ اور اس کا جو فائدہ' مقصد اور حکمت بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ شاید لوگ رجوع کریں' ہوش میں آئیں' اپنے طرزِ عمل پر نظر ثانی کرتے ہوئے اپنی غلط روی کو چھوڑیں' اور یہ آفات ارضی وسماوی شاید اُن کی آنکھیں کھولنے کا موجب بنیں اور وہ صراطِ مستقیم پر گامزن ہوسکیں۔

انسانی بداعمالیوں اور فسادِ بحر و بر میں باہمی ربط و تعلق

اب یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسانوں کی اجتماعی بداعمالیوں اور جرائم کے نتیجے میں سمندروں اور خشکی میں بھی بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے؟ اس فساد و بگاڑ کا انسانی بداعمالیوں سے بظاہر تو کوئی ربط و تعلق نظر نہیں آتا! دیکھئے یہ کائنات کچھ اصولوں کے تحت چل رہی ہے۔ کچھ ''قوانین فطرت'' ہیں جو سائنس نے دریافت کیے ہیں۔ ہوا اگر آندھی میں بدلتی ہے تو سائنسدانوں کے نزدیک اس کے کچھ اصول ہیں۔ پانی اگر سیلاب کی شکل اختیار کرتا ہے تو اس کے کچھ مادی اسباب ہیں۔ لیکن انسان کے اعمال کا اس روئے ارضی کے فساد اور فتنے سے کیا تعلق ہے؟ اس کے جواب کے حوالے سے سورۃ الرحمٰن میں ہمیں راہنمائی ملتی ہے۔ ارشاد ہوا: ﴿وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۝ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ۝﴾ ''اللہ نے آسمان کو بلند کیا اور میزان نصب کر دی' اس کا تقاضا ہے کہ تم میزان میں خلل نہ ڈالو''۔ تم میزان کے معاملے میں حد سے تجاوز مت کرو اور طغیانی اختیار نہ کرو' بلکہ میزان کے اندر رہ کر اس کی پاسداری کرو۔ اس کائنات میں میزان کا معاملہ ہمیں دو اعتبارات سے نظر آتا ہے۔ ایک تو ہم اِن ظاہری آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ کائنات کا ایک توازن (cosmic balance) ہے۔ اس کائنات میں لاتعداد کہکشائیں (Galaxies) ہیں' اُن میں سے ہر ایک میں بڑے بڑے فضائی کرّے' زمین کے حجم سے سینکڑوں ہزاروں گنا بڑے ستارے اور ان کے گرد گردش کرنے والے بے شمار سیارے ہیں۔ پھر ان کے اندر ایک توازن ہے اور یہ سب کے سب آسمان کے اندر تیر رہے ہیں۔ ازروئے الفاظ قرآنی: ﴿كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ﴾ ''ہر ایک آسمان میں تیر رہا

ہے''۔ایک ایک ستارے اور سیارے کی بیک وقت کئی کئی طرح کی گردشیں ہیں۔یہ کائناتی توازن تو سائنس دانوں اور مشاہدہ کرنے والوں کو بھی نظر آتا ہے' بلکہ اس کا ادراک تو ہمارے شاعروں کو بھی ہوا ہے۔جیسے میر تقی میر نے کہا تھا۔

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا!!

لیکن اس مادی توازن کے ساتھ یہاں ایک توازن اور بھی کارفرما ہے اور وہ ہے اخلاقی توازن۔اور ان دونوں کے مابین ایک بڑا نازک ربط ہے۔

یہ اخلاقی توازن کیا ہے؟ یہ اعلیٰ اخلاقی اقدار' عدل وانصاف کے راہنما اصول' حقوق وفرائض کا وہ متوازن نظام ہے کہ کوئی کسی کے حق پر ڈاکہ نہ ڈال سکے۔اس اخلاقی توازن کا ایک پرتَو انسان کے باطن میں ودیعت کر دیا گیا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس بارات (کائنات) کا دولہا قرار دیا ہے۔زمین وآسمان کے اس سلسلۂ تخلیق کا نقطۂ عروج حضرت انسان ہے۔سورۃ الشمس میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰهَا﴾ ''تو اللہ تعالیٰ نے اسے بدی اور پرہیزگاری کی تمیز الہام کر دی''۔اچھائی اور برائی میں تمیز کرنے کی اس صلاحیت کو عرفِ عام میں ضمیر (conscience) کہا جاتا ہے۔اس کے لئے قرآن مجید کی اصطلاح ''نفس لوّامہ'' ہے جو ہر انسان کے باطن میں ہے۔لیکن اس ضمیر یا نفس لوّامہ کا معاملہ خیر وشر میں تمیز کے حوالے سے صرف اشارات کی حد تک ہے۔گویا اس میں اجمال ہے۔ خاص طور پر اجتماعی نظام سے متعلق تفاصیل تک اس کی رسائی نہیں ہے کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط ہے' حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے' اخلاق کی کیا حدود ہیں' افراد کے مابین باہم حقوق وفرائض کا توازن کیا ہے' وغیرہ۔یہ سب معلوم کرنے کے لئے ہماری یہ آنکھیں اور عقل کافی نہیں ہے' بلکہ ناقص ہے۔اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے آسمانی وحی کا سلسلہ جاری فرمایا جو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو گیا تھا۔اس روئے ارضی پر پہلے انسان حضرت آدمؑ ہیں۔قرآن حکیم میں ہے: ﴿إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ

وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿٣٣﴾ (آل عمران) ''یقیناً اللہ تعالیٰ نے آدم ونوح (علیہما الصلوٰۃ والسلام) کو اور آل ابراہیمؑ اور آل عمران کو تمام جہان والوں میں سے چن لیا ہے''۔ جبکہ فکری و عملی اور خاص طور پر اجتماعی زندگی سے متعلق ہدایت اپنے نقطۂ عروج پر پہنچی رحمۃ للعالمین محمد رسول اللہ ﷺ پر ''الہدیٰ'' اور ''دین حق'' کی شکل میں ۔ ازروئے الفاظ قرآنی: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ (الصّف:۹' التوبۃ:۳۳) ''وہ (اللہ) ہی ہے جس نے اپنے رسول کو الہدیٰ اور دین حق کے ساتھ بھیجا' تا کہ اسے پوری جنس دین پر غالب کر دے' خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی نا گوار ہو''۔

یہاں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس مادی توازن کو جاننے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک علم ودیعت کر دیا تھا۔ ارشاد ہے: ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ ''اور اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو تمام اشیاء کے ناموں کی تعلیم دے دی''۔ یعنی بالقوۃ یہ علم انسان کو دے دیا گیا ۔ اور اس کو واقعیت اور حقیقت کا رنگ دینے کے لئے اسے apparatus (آلاتِ تجربہ) بھی دے دیا گیا ۔ ازروئے الفاظِ قرآنی : ﴿اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ﴿٣٦﴾﴾ (الاسراء) ''یقیناً (انسان کو دیعت کی گئی) سماعت' بصارت اور دل' ہر ایک کے بارے میں جواب دہی ہوگی''۔ تو اللہ تعالیٰ نے انسان کو سماعت و بصارت' مشاہدہ اور تجربات اور پھر استنباط و استدلال (inference) اور استخراج (deduction) کی صلاحیتیں دے رکھی ہیں ۔ ان کو بروئے کار لانے سے تمام مادی اسرار بے نقاب ہوتے چلے جاتے ہیں ۔ لیکن جو دوسرا اخلاقی پہلو ہے اس کے لئے انسان ہدایتِ ربّانی کا محتاج ہے ۔ اس کے لئے وہ دعا کرتا ہے : ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ ''(اے ربّ) ہماری سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کیجیو!'' ہماری عقل اور حواسِ خمسہ کی رسائی وہاں تک نہیں ہے ۔ اور اس معاملے میں انسان جو نظام بھی اپنی عقل سے وضع کرے گا وہ ظلم و تعدی' طغیان اور بغاوت پر مبنی ہوگا ۔ اس میں کبھی بھی عدلِ اجتماعی نہیں سمویا جا سکتا ۔ اسی لئے حضرت آدمؑ

کو جب زمین پر اترنے کا حکم ہوا تو مادی اشیاء کا علم عطا کر دینے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ﴾ (البقرۃ) ''پھر میری طرف سے جو کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لئے کوئی خوف نہیں ہے اور نہ ہی وہ غم زدہ ہوں گے''۔ یہ دنیا محض برتنے کا سامان ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کا سارا علم یہیں تک محدود ہے۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ لیکن انفرادی و اجتماعی ضابطۂ حیات کے لئے فکری و عملی راہنمائی کی خاطر جو شخص ہدایت ربانی کی تابع داری کرے گا تو اللہ کا وعدہ ہے کہ اس کے لئے نہ کوئی خوف ہے اور نہ حزن۔ اور اس ہدایت کا سلسلہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جاری وساری فرما دیا اور دین وشریعت کی صورت میں انسان کو وہ لائحہ عمل اور اجتماعی نظامِ اخلاق عطا فرما دیا جو دنیا میں امن و امان اور آخرت میں عظیم کامیابی کا ضامن ہے۔

سورۃ الروم کی زیرِ نظر آیت اور سورۃ الرحمٰن کی مذکورہ آیات کو سامنے رکھیں تو یہ عجیب نکتہ سامنے آتا ہے کہ انسان اگر اجتماعی طور پر اس اخلاقی میزان کو پامال کرے' عدل وانصاف کے اصولوں کی دھجیاں بکھیرے تو زمین کا مادی توازن بھی بگڑنے لگتا ہے۔ جیسے فرمایا گیا ہے: ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا کَسَبَتْ اَیْدِی النَّاسِ﴾ یہ آفاتِ ارضی وسماوی یعنی سیلاب' قحط سالی' زلزلے' پانی کی کمی کا مسئلہ' یہ سب اصل میں انسان کی اپنی بداعمالیوں' اخلاقی بگاڑ اور ظلم وناانصافی کا نتیجہ ہیں۔

اس کے حوالے سے جو آخری منطقی بات ہے وہ میں آپ کے سامنے گوش گزار کرتا ہوں۔ جن حضرات نے قربِ قیامت کے حالات کے حوالے سے احادیث کا مطالعہ کیا ہے ان کو معلوم ہے کہ قیامت سے قبل پورے کرۂ ارضی پر ایک مرتبہ وہ دین حق لازماً قائم وغالب ہوگا جو رحمۃ للعالمین ﷺ لے کر آئے ہیں' لیکن اس کے بعد پھر زوال آئے گا تو ایک موقع پر اللہ تعالیٰ نیک لوگوں کو اٹھا لے گا اور باقی شر ہی شر اور فساد ہی فساد ہوگا۔ چنانچہ جب نری معصیت' طغیانی' سرکشی اور ابلیسیت رہ جائے گی تو

کائنات کا مادی نظام اور توازن بھی بالکل درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ اسی کا نام قیامت ہے جو اس دنیا کے خاتمے کا اعلان ہے۔ سورۃ الانفطار میں ارشادِ الٰہی ہے: ﴿اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۝ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۝ وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝﴾ ''جب آسمان پھٹ جائے گا' اور جب تارے بکھر جائیں گے' اور جب سمندر پھاڑ دیے جائیں گے......'' سورۃ التکویر میں فرمایا: ﴿اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۝ وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝﴾ ''جب سورج لپیٹ دیا جائے گا' اور جب تارے بکھر جائیں گے' اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے......'' سورۃ القیامۃ میں ارشاد ہوا ہے: ﴿فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝﴾ ''پھر جب دیدے پتھرا جائیں گے' اور چاند بے نور ہو جائے گا' اور چاند اور سورج ملا کر ایک کر دیے جائیں گے......'' مختصراً یہ کہ یہ کائناتی توازن بگڑ جائے گا۔ قرآن و حدیث سے کم سے کم یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ نظامِ شمسی تو درہم برہم ہو جائے گا اور یہ ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ﴾ کا نقطۂ عروج (climax) ہوگا۔ اب تک کی بحث کا حاصل یہ ہے کہ انسان کی اپنی بداعمالیوں اور اللہ کی نصب کردہ اخلاقی میزان کو پامال کرنے کے نتیجے میں زمین فتنہ وفساد سے بھر جاتی ہے۔ ان دونوں کائناتی اور اخلاقی میزانوں میں بڑا گہرا تعلق ہے۔

اس کا ایک converse اور عکس بھی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ بھی قرآن مجید کے حوالے سے سامنے آ جائے تاکہ یہ مضمون مکمل ہو جائے۔ اگر انسان اس اخلاقی بیلنس کو اس دنیا میں قائم کرے' یعنی نظامِ عدلِ اجتماعی' دینِ حق' اللہ کی عطا کردہ شریعت کو قائم و نافذ کرے تو اس کا فی الفور فائدہ یہ ہوگا کہ دنیا میں امن و امان قائم ہوگا' خوف اور دہشت ختم اور فتنہ وفساد رفع ہو جائے گا۔ جیسے آیۂ استخلاف میں ارشاد ہے: ﴿وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا﴾ (النور:۵۵) ''اور وہ لازماً ان کے خوف کی حالت کو امن میں بدل دے گا''۔ اسی طرح اہل کتاب سے فرمایا گیا ہے: ﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ

اَرْجُلِهِمْ ﴾ (المائدۃ:٦٦) ''اور اگر وہ (اہل کتاب) تورات اور انجیل کو اور اپنے رب کی طرف سے نازل کردہ شریعت کو قائم و نافذ کرتے تو وہ اپنے اوپر سے بھی کھاتے اور قدموں کے نیچے سے بھی''۔ یعنی اللہ کی حدود اور شریعت کے نفاذ کے نتیجے میں زمین بھی اپنے خزانے اگل دیتی ہے اور آسمان سے بھی برکتیں نازل ہوتی ہیں۔ ایک آدمی جس کی نظر صرف مادی اسباب پر ہے وہ تو کہے گا کہ یہ تو ''ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ'' والی بات ہے' لیکن یہ ایک حقیقت اور سنت الٰہی ہے کہ اس توازن (balance) کو دنیا میں قائم کرنے کا یہ نتیجہ لازماً نکلتا ہے۔ اور یہ بھی سمجھ لیجیے کہ فتنہ وفساد اگر ختم ہوسکتا ہے تو صرف اور صرف دین حق کے قیام کی صورت میں ہوسکتا ہے اور موجودہ عالمی حالات اس حقیقت کے سب سے بڑے شاہد ہیں۔

زمین پر فتنہ وفساد کی مختلف صورتیں

اب میں اگلی بحث کی طرف آ رہا ہوں۔ اس فتنہ وفساد کی بہت سی صورتیں ہیں جن میں سے ہمیں چند ایک کا تعین کر لینا چاہیے۔

سب سے پہلی اور سب سے نمایاں صورت تو یہ آفاتِ ارضی و سماوی یعنی یہ زلزلے' قحط' سیلاب وغیرہ ہیں۔ یہ سب چیزیں مسبب الاسباب کے کنٹرول میں ہیں۔ یہ معتدل چلنے والی ہوا کب طوفان کی شکل اختیار کر لے' یہ اُس کے ہاتھ میں ہے۔ یہ پانی کب سیلاب بن جائے' اس پر اسی کا کنٹرول ہے۔ قومِ لوطؑ پر جو عذاب آیا تھا' قرآن مجید نے اس کا بار بار تذکرہ کیا ہے۔ جب اخلاقی توازن بہت بری طرح بگڑا اور پوری قوم بے راہ روی کی انتہا کو پہنچی تو پھر ایک زوردار زلزلہ آیا تھا جس میں سدوم اور عامورہ کی بستیاں تلپٹ ہو کر رہ گئیں۔ فرمایا گیا: ﴿فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ﴾ (الحجر) ''اور ہم نے اس بستی کے اوپر والے حصے کو نیچے والا بنا دیا اور ان پر پکی ہوئی مٹی کے پتھروں کی بارش کی''۔ اِس وقت بھی ہماری مادی نگاہوں نے یہ دیکھ لیا ہے کہ امریکہ میں کیلی فورنیا سٹیٹ کا سان فرانسسکو کا علاقہ' جہاں جنسی جرائم اپنے نقطۂ عروج پر ہیں' شدید زلزلوں کی زد میں ہے۔ اس کا ٹرائیگر

کب دے گا یہ اللہ کو معلوم ہے' اس لئے کہ وہی مسبب الاسباب ہے۔

آج کا سب سے بڑا مسئلہ جس پر انسان کو کوئی کنٹرول نہیں ہے' وہ پانی کی قلت کا مسئلہ ہے۔ واٹر ٹیبل بہت تیزی سے نیچے جا رہا ہے اور مادی نگاہیں رکھنے والوں نے یہ دیکھ لیا ہے کہ آئندہ سب سے بڑا مسئلہ پانی کی کمی کا ہے۔ یہ عالمی مسئلہ ہے اور آئندہ عالمی جنگیں ہوں گی تو اِس بنیاد پر ہوں گی۔ ہم بھی ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں لیکن ہمارے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے۔ قرآن حکیم میں ارشادِ الٰہی ہے: ﴿قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ﴾ (الملک) ''ان سے کہہ دیجئے کہ کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر تمہارے کنوؤں کا پانی زمین میں اتر جائے تو کون ہے جو اِس پانی کی بہتی ہوئی سوتیں تمہیں نکال کر لا دے گا؟'' یہ آفاتِ ارضی و سماوی تو فتنہ و فساد کی صرف ایک شکل ہے۔ اس فساد کی ایک اور بدترین شکل اللہ کا یہ عذاب ہے کہ: ﴿اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ﴾ (الانعام:٦٥) ''یا وہ تمہیں گروہوں میں تقسیم کر کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کی طاقت کا مزہ چکھوا دے''۔ یہ قتل و غارت گری اور ظلم و تعدی اسی عذاب کی ایک شکل ہے۔ انسان کے پاس جب کچھ طاقت آتی ہے تو پھر وہ فرعون بن جاتا ہے۔ بقول اقبال ؎

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک

چنگیز خان منگولیا کے صحراؤں سے آندھی کی طرح اٹھا اور کروڑوں کو قتل کرتا ہوا بغداد تک جا پہنچا۔ اسکندر اعظم یونان سے اٹھا اور پھر یہاں ہمارے اس علاقے تک آیا۔ پھر ہٹلر کا کردار دیکھ لیجئے۔ اور بہت سی عالمی جنگیں کیا ہیں! یہ وہی ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا﴾ کا نقشہ ہے۔

آج اس حوالے سے سب سے نمایاں لفظ ''دہشت گردی'' ہے۔ اصل میں دہشت گرد کون ہے' یہ الگ بحث ہے۔ ہمارے نزدیک اس وقت عدل و انصاف کا خون کرنے والا اور سب سے بڑا ظالم اسرائیل ہے' اور اس سے بھی بڑا ظالم امریکہ

ہے جو عدل وانصاف کی دھجیاں بکھیرنے میں اس کی حمایت کرتا ہے' اور ہر وہ قرارداد جس میں ان کے ظلم کے خلاف کوئی آواز بلند کی جائے' اسے ویٹو کرتا ہے۔ عدل و انصاف کی اس سے زیادہ برے انداز میں دھجیاں نہیں بکھیری جاسکتیں۔ تو اصل دہشت گرد تو امریکہ' اسرائیل' بھارت' سی آئی اے' موساد اور ''را'' ہیں۔ اس وطن عزیز پاکستان میں جو دہشت گردی کے واقعات ہو رہے ہیں ان کے کرانے والے اصل میں ''را'' اور ''موساد'' ہیں۔ ہماری حکومت کو بھی یہ سب معلوم ہے لیکن یہ اس کی نااہلی ہے کہ وہ ملک دشمن عناصر کی سازش کو ناکام بنانے سے قاصر ہے۔ فرقہ وارانہ کشیدگی کی آڑ میں مسجدوں اور امام باڑوں پر حملے کرنا کسی مسلمان کا کام نہیں ہوسکتا۔ ہاں کچھ سرپھرے لوگوں کو وہ استعمال کر رہے ہیں۔ کون ہیں جنہوں نے یہاں سازشوں کے بازار گرم کیے ہیں؟ کون ہیں جو انہیں وسائل فراہم کرتے ہیں؟ کون ہیں جو پیچھے سے ان کی ڈور ہلاتے ہیں؟ ہماری حکومت کا کام تو یہ ہے کہ ان کو کنٹرول کرے۔ نہیں کر سکتی تو نااہلی کی بنا پر اسے حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس دہشت گردی کے حوالے سے ایک بات طے شدہ ہے کہ آج پوری دنیا دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے۔ امریکہ نے بھی دہشت گردی کے خلاف نام نہاد عالمی مہم شروع کی ہے جو خود سب سے بڑی دہشت گردی ہے۔ اس حوالے سے دنیا دو حصوں میں منقسم نظر آتی ہے' یا تو دہشت گرد طبقات ہیں یا پھر دہشت زدہ لوگ ہیں۔ غرضیکہ پورے کرۂ ارضی پر اس وقت ''دہشت'' کا راج ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ کی ایک بڑی بھیانک شکل ہے۔

فتنہ وفساد کی ایک تیسری شکل انسانوں کا شرفِ انسانیت سے محروم ہو کر اور انسانیت کا لبادہ اتار کر حیوانوں کی سطح پر آ جانا ہے۔ یہ اصل میں ابلیس کا مشن تھا جو اِس دور میں آ کر اس نے انتہائی کامیابی سے مکمل کر لیا ہے۔ یہ فتنہ وفساد بھی اپنے کلائمکس پر ہے' پوری دنیا میں اس سے پہلے اس طرح نہیں تھا جیسے آج ہے۔ پوری دنیا سودی معیشت کے شکنجے میں ہے۔ ہمارے مشرف صاحب بھی سنیں اور باقی لوگ بھی سنیں کہ

حکیم الامت علامہ محمد اقبال سود کے بارے میں کیا فرماتے ہیں، جن کی تعریف میں سب رطب اللسان ہیں، چاہے وہ ہمارے دانشور ہوں یا حکومتی طبقے کے لوگ ہوں، لیکن ان کے پیغام کو پاؤں تلے روندتے ہیں۔ ان کا فرمان ہے۔

از ربا جاں تیرہ، دل چوں خشت و سنگ
آدمی درّندہ بے دندان و چنگ!

سودی معیشت کے نتیجے میں روح تو بالکل مُردہ ہو جاتی ہے اور دل پتھر اور اینٹ کی مانند سخت ہو جاتا ہے، اور جو سود خور ہیں وہ عملاً درندوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ درحقیقت بھیڑیئے ہیں، انسانی مرّوت، نرمی، بھائی چارہ، دوسروں کے کام آنا وغیرہ کے الفاظ سود خوروں کی لغت سے خارج ہو جاتے ہیں۔ آج پوری دنیا پر یہ سودی معیشت مسلط ہے۔ اور جن سے سود لیا جا رہا ہے وہ درندے تو نہیں بنتے لیکن انسانیت سے وہ بھی گر جاتے ہیں۔ وہ ڈھور ڈنگر بن جاتے ہیں۔ پھر وہ بات صادق آتی ہے کہ۔

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے!

روزگار کا غم کسی اونچے خیال کو قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتا کہ کوئی اللہ ہے، کوئی آخرت ہے، کوئی ہماری دینی ذمہ داریاں ہیں! بلکہ یہ کولہو کے بیل اور لدو اونٹ بن جاتے ہیں۔ اس طرح سے نہ وہ انسان رہے نہ یہ انسان رہے۔

دوسرے یہ کہ حیا انسان کا اصل زیور اور اس کی زینت ہے، یہ اصل میں انسانیت اور حیوانیت میں واضح فرق کی حیثیت رکھتی ہے، اس حیا کے لباس کی بھی دھجیاں بکھیر دی گئی ہیں جو کہ شیطان کا اہم کام تھا۔ جیسے کسی شاعر نے کہا ہے۔

جس سے انسانیت عبارت تھی
وہ حیا آج عنقا ہے!

انسان پورے طور پر حیوانوں کی سطح پر آ چکا ہے، کوئی فرق نہیں رہا۔ بلکہ میں اگر یہ کہوں کہ ﴿اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ﴾ (الاعراف:۱۷۹) تو غلط نہیں ہوگا۔ انسان

اس معاملے میں حیوانات سے بھی گیا گزرا ہے۔ یہ فتنہ وفساد کی وہ شکل ہے جس کی طرف ہماری توجہ نہیں جاتی۔ آج کا انسان شرفِ انسانیت سے محروم ہو چکا ہے۔ دیکھئے قتل وغارت گری کے نتیجے میں تو انسانوں کا خون ہوتا ہے۔ چنگیز' سکندر اور ہٹلر کے ہاتھوں سے انسانوں کا خون ہوا یا اب بش کے ہاتھوں سے ہو رہا ہے جو اِس وقت کا ہٹلر اور چنگیز ہے۔ لیکن سودی نظام اور بے حیا تہذیب کے نتیجے میں تو ''انسانیت'' کا خون ہوتا ہے۔

نوٹ کر لیجئے کہ قرآن کی رو سے اصل فتنہ وفساد کیا ہے؟ غیر اللہ کی حاکمیت پر مبنی جو بھی نظام ہے وہ ظلم وتعدی اور استحصالی نظام ہے' وہ طاغوت اور بغاوت ہے۔ دین حق اور ربّ کے نظام کے سوا کسی بھی باطل نظام کا تسلط ہو گا تو اس کا نتیجہ لازماً فتنہ وفساد ہو گا۔ اسی فتنے کو فرو کرنے آئے تھے حضور ﷺ اور اسی کا حکم ہے مسلمانوں کو کہ: ﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (الانفال:۳۹) ''اور جنگ کرو اِن کفار ومشرکین سے یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین کل کا کل اللہ کے لئے ہو جائے''۔ جب غیر اللہ کی حاکمیت کا نظام ہے تو یہ اللہ کے خلاف سب سے بڑی بغاوت ہے۔ فرعون نے جو نعرہ لگایا تھا کہ ﴿اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى﴾ (النّٰزعٰت) یہ نیو ورلڈ آرڈر کا نعرہ اسی کا ایک latest version ہے۔ یہ گویا اِس بات کا اعلان ہے کہ اوّل تو ہمیں نہیں معلوم کہ آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا کوئی اللہ بھی ہے۔ اگر ہے بھی تو وہ آسمانوں میں اپنی حکمرانی کرے' یہاں زمین پر اس کی حکمرانی نہیں چلے گی' یہاں ہماری بات مانی جائے گی۔ یہاں کا قانون ہم بنائیں گے' یہاں جائز وناجائز اور حلال وحرام کے فیصلے ہم کریں گے' ہم کسی آسمانی شریعت کو نہیں مانتے۔ یہ سیاسی شرک اللہ کے خلاف سب سے بڑی بغاوت ہے۔

تو اس دوسری بحث کا حاصل یہ ہوا کہ تاریخ انسانی میں اللہ کے خلاف اتنی بڑی بغاوت اور اتنے بڑے پیمانے پر فتنہ وفساد پہلے کبھی نہیں تھا جو آج ہے۔ اور اسی فساد کا نام ہے دجالی فتنہ اور دجالی تہذیب۔ یہ یک چشمی تہذیب ہے اس کی مادی علوم والی

آنکھ کھلی ہے اور اِن کو حاصل کرنے کے ذرائع' سائنس اور ٹیکنالوجی اپنے نقطۂ عروج پر ہیں۔ لیکن اخلاقی اور روحانی تعلیم اور علمی اور فکری راہنمائی کے لئے جو آسمانی ہدایت ہے اس سے آنکھیں بند کر لی گئی ہیں۔ اسی طرزِ عمل نے بڑھ کر اس دجالی تہذیب کی شکل اختیار کی ہے جس سے ہر نبی اور رسول نے پناہ مانگی ہے۔

فتنہ وفساد کے تدارک کے ضمن میں اللہ کی سنت

اللہ تعالیٰ کی ایک سنت ہے کہ جب فتنہ وفساد حد سے بڑھتا ہے تو اس کا قلع قمع کرنے کے لئے اس کی خدائی حکومت حرکت میں آتی ہے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ اللہ تعالیٰ کی اس سنت کی طرف یوں توجہ دلائی گئی ہے: ﴿قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلُ ۭ﴾ (الروم:۴۲) ''(اے محمدؐ) ان سے کہہ دیجئے کہ ذرا زمین میں گھومو پھرو اور دیکھو کہ کیا انجام ہوا پہلے والے لوگوں کا!'' پہلی تہذیبوں اور قوموں نے اللہ سے بغاوت کی تھی تو کوئی سیلاب میں غرق کر دیا گیا' کوئی زلزلے میں مارا گیا۔ ایک جگہ اس کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے: ﴿فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۭ﴾ (الانعام:۴۵) ''تو ایسی ظالم قوم کی جڑ کاٹ دی گئی''۔ تو عذاب کی ایک صورت تو یہ ہے۔ اللہ کی دوسری سنت یہ ہے کہ: ﴿وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ﴾ (البقرۃ:۲۵۱) ''اگر اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں کے ذریعے دوسروں کو دفع نہ کرتا رہے (حق کی قوتوں کے ذریعے باطل کے علمبرداروں اور باطل تہذیبوں کا خاتمہ نہ کرتا رہے) تو زمین فتنہ وفساد سے بھر جائے''۔ چنانچہ ہر دَور میں باطل کا قلع قمع کرنے کے لئے اہل حق اٹھتے رہے ہیں۔ ایک جگہ ارشاد ہے: ﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۭ﴾ (الانبیاء:۱۸) ''بلکہ ہم حق کا کوڑا برساتے ہیں باطل کی پیٹھ پر تو وہ اس کا بھیجہ نکال دیتا ہے اور وہ دیکھتے دیکھتے مٹ جاتا ہے''۔ وہ کوڑا بننے والے کون ہیں؟ وہ آنحضور ﷺ اور آپؐ کے ساتھی رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں۔ پچھلی اُمتوں میں بھی ایسی اقوام گزری ہیں۔ تاریخ میں ایسی مثالیں موجود ہیں۔ ایک جگہ ارشاد ہے: ﴿كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ

اللّٰہِ ط﴾ (البقرۃ:۲۴۹) ''کتنے قلیل گروہ ایسے تھے جو اللہ کے اِذن سے بڑے گروہوں پر غالب آ گئے!'' حضرت داوٗد علیہ السلام نے جالوت کو قتل کیا جو اُس وقت کی شر کی طاقت تھی۔ فرمایا گیا:﴿وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ﴾ (البقرۃ:۲۵۱) تو فرمایا جارہا ہے کہ ہم حق کا کوڑا بنا کر باطل کی پیٹھ پر برسا کر باطل کا بھیجہ نکال دیتے ہیں تو وہ بالکل نابود ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ اللہ کی سنت ہے۔

تاریخ انسانی میں اس سے پہلے کے تمام معاملات کسی خاص علاقے تک محدود تھے۔ ان کی حیثیت علاقائی مظاہر (local phenomena) کی تھی۔ لیکن اب باطل کا تسلط ہمہ گیر اور ہمہ جہت ہے' پورے کرۂ ارض پر ہے اور بظاہر بہت ہی مستحکم ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ صحیح احادیث میں یہ بات موجود ہے کہ اگرچہ اس وقت اہل حق انتہائی کمزور ہیں' بے بس ولاچار ہیں' ان پر قافیہ حیات تنگ کر دیا گیا ہے' بتدریج گھیرا مزید تنگ ہو رہا ہے' لیکن بالآخر اُن کی قربانیاں' استقامت اور جدوجہد رنگ لائے گی اور پھر اللہ کی مدد آئے گی جیسے پہلے آیا کرتی تھی۔ آنحضور ﷺ اور صحابہ کرام ؓ کی بھی غیبی مدد ہوئی تھی' مگر اُس وقت جبکہ وہ مصائب وتکالیف کی بھٹیوں سے گزارے گئے اور انہوں نے عزیمت واستقامت کے تمام امتحان پاس کر لئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کیفیت کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا یَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰی یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰی نَصْرُ اللّٰهِ ؕ﴾ (البقرۃ:۲۱٤)

''کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے' حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزرا ہے۔ ان پر سختیاں گزریں' مصیبتیں آئیں' وہ ہلا مارے گئے' حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟''

اہل حق کو جھنجوڑا جارہا ہے کہ تمہاری بھی غیبی مدد ہو گی لیکن تمہیں پہلے جانی ومالی قربانیاں دینی ہوں گی' مصائب وتکالیف کی بھٹیوں سے گزرنا ہو گا جیسے حضور ﷺ اور صحابہ کرام

ﷺ کو گزارا گیا۔ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی!

اس وقت بھی بظاہر باطل کا تسلط ہے۔ ہر طرف باطل ہی باطل نظر آتا ہے۔ دجالی سوچ یہی کہتی ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ (معاذ اللہ) باطل کے ہاتھوں بے بس اور لاچار ہو گیا ہے کہ وہ حق کی نصرت پر قادر نہیں رہا۔ ذہنیت یہ بن گئی ہے کہ: ﴿حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا﴾ (یوسف: ۱۱۰) ''یہاں تک کہ جب پیغمبر لوگوں سے مایوس ہو گئے اور لوگوں نے بھی سمجھ لیا کہ ان سے جھوٹ بولا گیا تھا''۔ لیکن ساتھ ہی فرمایا گیا ہے: ﴿جَآءَهُمْ نَصْرُنَا﴾ ''تو (اس کے بعد) فوراً ہماری مدد اُن کو پہنچی''۔ لہٰذا مایوس ہونے کا کوئی جواز نہیں' گو ہر طرف باطل کا غلبہ ہے لیکن اللہ کی مدد اَب بھی آئے گی' اہل حق کی قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی اور ان شاء اللہ باطل نابود ہو گا اور اہل حق غالب ہو کر رہیں گے۔ تاہم اُس سے پہلے ابھی عشق کے کتنے اور امتحان باقی ہیں' یہ اللہ ہی کے علم میں ہے۔

فتنہ وفساد کی یلغار کا نشانہ عالم اسلام ہی کیوں؟

اب آیئے اس بات کی طرف کہ عالم اسلام پر ہی اس سارے فتنہ وفساد کی یلغار کیوں ہے؟ عملاً تو یہ صورت حال درست دکھائی دیتی ہے کہ۔

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر!

بظاہر تو یہ شکوہ بھی درست معلوم ہوتا ہے کہ ہم اللہ کے نام لیوا ہیں لیکن پوری اسلامی دنیا پر جو قیامت ٹوٹ رہی ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ دراصل اس کا سبب بھی یہی ہے جو سورۃ الروم میں بیان ہوا: ﴿بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا﴾ ہم نے بھی وہ دجالی تہذیب اور باطل نظام پورے کا پورا اختیار کر رکھا ہے۔ ہم اسی سیکولرزم' اللہ کے خلاف بغاوت اور نیو ورلڈ آرڈر کے نعرے کو promote کر رہے

ہیں۔اسی سودی معیشت کے اندر ہم بھی پوری طرح ملوث ہیں اور اللہ کے خلاف اس بغاوت اور اعلانِ جنگ میں دامے درمے سخنے شریک ہیں۔اسی بے حیا مادر پدر آزاد شیطانی تہذیب کے لئے ہم اپنے دروازے کھولنے کے لئے صرف تیار ہی نہیں بلکہ کھول چکے ہیں اسے import کر چکے ہیں۔

اس پر مستزاد یہ کہ آج امت مسلمہ ہر اعتبار سے طاغوت کا اڈا بن چکی ہے۔ ۵۷ مسلمان ممالک ہیں اور بلا استثناء سب کے حکمران اور حکمران طبقہ طاغوتی قوتوں کا ایجنٹ بنا ہوا ہے۔ پورے کرۂ ارضی پر اس عالمی طاغوت کے خلاف بغاوت کی صرف ایک باریک اور نحیف سی آواز اٹھی تھی اور دین حق کے قیام کی کوشش ہوئی تھی۔اور وہ ہماری برابر کی سرزمین افغانستان میں ہوئی تھی جو وسائل جنگی قوت اور دولت کے اعتبار سے دنیا کا کمزور ترین ملک بن چکا تھا۔وہاں شریعت الٰہی کا نفاذ ہونے لگا تو آپ نے دیکھا کہ پوری عالمی قوتیں اکٹھی ہو کر اس پر ٹوٹ پڑیں۔اس کے اگرچہ بہت سے اسباب بیان کئے جاتے ہیں جو صرف لیپا پوتی ہے۔اصل معاملہ یہ ہے کہ افغانستان میں دین و شریعت کا نفاذ باطل نظام کے خلاف ایک چیلنج تھا جو طاغوت کو گوارا نہیں ہوا۔اور ہماری بے غیرتی کا عالم یہ ہے کہ ہم اس پر کریڈٹ لیتے ہیں کہ وہاں کی طالبان حکومت کو ختم کرنے میں ہمارا بڑا رول ہے ہم نے اگر ان کے خلاف امریکہ سے تعاون نہ کیا ہوتا تو امریکہ کو یہ کامیابیاں نہ ملتیں۔اللہ کا عرش بھی تھرتھرا اٹھتا ہوگا جب ایسے الفاظ ہمارے حکمرانوں کی زبانوں سے نکلتے ہوں گے۔یہ بہت بڑا کلمۂ جسارت ہے اور اس کی جو سزا اہل پاکستان کو ملنے والی ہے (اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے) وہ بہت سنگین سزا ہو سکتی ہے۔ہم بھی اسی طاغوتی نظام کا حصہ بن گئے ہیں جو پوری دنیا میں مسلط ہے اور اپنے دین حق سے غداری اور بے وفائی کے مرتکب ہوئے ہیں۔

مسلمان اقوام کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کی دو سنتیں ہیں۔اگر اللہ کی نمائندہ قوم جس کی طرف اللہ نے اپنے رسول کو بھیجا ہو جس کی طرف اللہ نے کتاب اتاری ہو جسے اللہ نے شریعت عطا کی ہو وہ جب تک شریعت پر کاربند رہے گی تو اس کے لئے اللہ کی

نصرت وحمایت اور اس کی طرف سے برکات کا نزول لازماً ہوگا' یہ اللہ کا وعدہ ہے۔ لیکن جب وہ بے وفائی کریں گے تو عذاب کا ایک حصہ انہیں دنیا میں بھی ضرور ملے گا۔ اس عذاب کی شکل کیا ہے؟ فرمایا: ﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ (البقرۃ:٦١) ''اور (آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ) ذلت وخواری اور پستی وبدحالی ان پر مسلط ہوگئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے۔'' اور جب تک وہ اپنی اس غلطی اور کوتاہی کو دُور نہیں کریں گے اللہ کے غضب کے اندر رہیں گے۔ چنانچہ اسی کا یہ مظہر ہے کہ اس وقت اس اُمت کی بے بسی اور لاچاری کا یہ عالم ہے کہ امریکہ ایک کے بعد ایک کو نشانہ بنا رہا ہے اور ہم خود اس کے ساتھ اس ''مقدس مہم'' میں شریک ہیں۔ ہر عامی کو بھی نظر آ رہا ہے کہ امریکہ کی یہ مہم دہشت گردی کے خلاف نہیں' یہ عالم اسلام کے خلاف ہے اور ہم اس کے اندر خود شریک ہیں۔ ہماری کمزوری' لاچاری' بے بسی کا یہ عالم ہے کہ امریکہ ایک کے بعد دوسرے کو نشانہ بناتا ہے' جیسے قصائی ایک بھیڑ کو ذبح کرنے کے بعد دوسری کو پکڑ لیتا ہے لیکن باقی ٥٦ ممالک یہ نہیں سوچتے کہ مل بیٹھ کر کیسے اس مصیبت سے دفاع کیا جائے' بچنے کی کیا حکمت عملی اختیار کی جائے؟ اگر debates ہوتی ہیں تو صرف اس ایشو پر کہ اگلی باری کس کی ہے۔ اس سے زائد کوئی بات نہیں۔ پورا عالم اسلام اس وقت بھیڑ بکری بنا ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تو ہم پر یہ واضح کر دیا تھا کہ میں جو شریعت تمہیں عطا کر رہا ہوں اس کو پورے کا پورا اختیار کرو۔ فرمایا: ﴿اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً﴾ (البقرۃ:٢٠٨) ''اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ''۔ اگر دین اسلام اور شریعت الٰہی میں ڈنڈی مارو گے' اس کے کچھ حصے پر عمل کرو گے اور کچھ حصے کو نظر انداز کیے رکھو گے' اسے پاؤں تلے روندتے رہو گے تو پھر اللہ کی سنت عمل میں آ کر رہے گی۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ٨٥ میں اس کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ: ﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ﴾ ''تو کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان

لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیئے جائیں!'' پہلے یہود نے اس حرکت کا ارتکاب کیا تھا اور آج ہم سوائے ایک نہایت قلیل تعداد کے' بحیثیت مجموعی اس جرم کا ارتکاب بڑی ڈھٹائی کے ساتھ کر رہے ہیں۔ چنانچہ آج ہماری معیشت بھی اللہ کے خلاف بغاوت پر مبنی ہے اور معاشرت بھی ہے۔ ہاں نمازیں پڑھ لیتے ہیں' حج اور عمرے کر رہے ہیں' روزے رکھ لیتے ہیں۔ یہ من چاہی جزوی بندگی اللہ کو قبول نہیں ہے۔ یہ میرا یا کسی بھی عالم کا فتویٰ نہیں ہے' بلکہ خود اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ جو کوئی ایسی حرکت کرے' خواہ وہ اللہ اور اس کے رسول کا کتنا ہی نام لیوا ہو' اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو دنیا میں ذلیل و رسوا کر دیا جائے گا اور وہ قیامت کے دن سخت ترین عذاب میں دھکیل دیئے جائیں گے۔ ہم بڑے مطمئن ہیں کہ کچھ بھی کریں ہیں تو مسلمان' جنت اللہ نے ہمارے لئے ہی تو بنائی ہے۔ ہر شخص جنت کا مستحق اور مدعی بنا بیٹھا ہے' لیکن اللہ تعالیٰ کا فیصلہ کچھ اور ہے۔ اللہ تعالیٰ اس انجامِ بد سے ہمیں بچائے!

ہمارا دوسرا جرمِ عظیم یہ ہے کہ ہم نے بحیثیت اُمت اللہ کے دین سے بے وفائی کا معاملہ کیا ہے۔ آج دنیا کے نقشے پر موجود ۵۷ اسلامی ممالک میں سے کوئی ایک ملک بھی ایسا نہیں ہے جہاں مسلمانوں نے اللہ کے دین اور اس کی شریعت کو مکمل طور پر قائم و نافذ کیا ہو۔ لہٰذا صورت حال یہ ہے کہ مسلمانوں پر مسلسل برق گر رہی ہے۔ روئے زمین پر ہر جگہ ذلت و رسوائی مسلمانوں کا مقدر ہے۔ ہر جگہ مسلمان ہی مار کھاتے اور دشمنانِ اسلام کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتے نظر آتے ہیں۔ پورا عالمِ اسلام اللہ کے عذاب کی لپیٹ میں ہے۔ اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ اور آگے بڑھنے والا ہے۔

پاکستان کی حالت زار کا تجزیہ

اب آ جائیے پاکستان کی طرف! ہم بھی اسی عذابِ الٰہی کی زد میں ہیں۔ اُن تمام جرائم میں جن کا میں نے ذکر کیا ہے' ہم کسی سے پیچھے نہیں ہیں' بلکہ اس وقت تو ہم

ابلیسی طاقتوں اور اللہ اور اس کے دین کے دشمنوں کے 'اتحادی' اور فرعونِ وقت یعنی امریکہ کے front line state بنے ہوئے ہیں۔ پوری قوم کے اجتماعی جرائم کی سزا ہے جو اِس وقت ہمیں مل رہی ہے۔ ہم عملاً اپنی آزادی سے محروم ہو چکے ہیں' امریکہ کے غلام بن چکے ہیں اور امریکہ کے دباؤ پر ہم اپنے قومی مفادات کو خود اپنے ہاتھوں قربان کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ اسلامی اقدار اور نظریۂ پاکستان کی دھجیاں ہم خود بکھیر رہے ہیں اور اس طرح قدم بقدم قومی خودکشی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ پہلے تو by proxy حکومت ہوتی تھی جبکہ اب امریکہ خود کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ وہ یہاں اپنا نصابِ تعلیم لا رہا ہے۔ گویا یہاں آئندہ اسلام وہ چلے گا جو یہود و نصاریٰ کی طرف سے certified (منظور شدہ) ہو۔ ہر سطح پر امریکہ اپنی مرضی اور اپنی پالیسی ہم پر مسلط کر رہا ہے چاہے وہ یہاں کے قوانین ہوں' یہاں کا نصابِ تعلیم ہو' یہاں کا نظامِ حکومت ہو یا یہاں کا فوجی سسٹم ہو۔ اور ہمارے اربابِ اختیار اس کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہیں۔ لیکن میں جو بات عرض کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ پوری قوم کے جرائم کی سزا ہے۔ حضور ﷺ نے یہ بات ہمیں کھول کر بیان کر دی تھی کہ ((كَمَا تَكُوْنُوْنَ كَذٰلِكَ يُؤَمَّرُ عَلَيْكُمْ)) ''جیسے تم خود ہو گے ویسے ہی حکمران تم پر مسلط کر دیئے جائیں گے''۔ یہ جو ہم پر حکمران آتے رہے ہیں' وہ نواز شریف ہوں' بے نظیر ہوں یا اب مشرف صاحب ہیں' یہ سب ۔

ہم ہوئے' تم ہوئے کہ میر ہوئے !
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

کا مصداق تھے۔ بھاگتے تو سب امریکہ کی طرف ہی تھے اور ہیں' پناہ تو وہیں جا کر لیتے ہیں' ہر معاملے میں رجوع تو انکل سام ہی کی طرف کیا جاتا ہے۔ تو آج مسلمانانِ پاکستان جن اعصاب شکن حالات سے دوچار ہیں یہ دراصل اس قوم کے اجتماعی جرائم کی سزا ہے۔ میں اب چند نکات کی صورت میں یہ بیان کروں گا کہ پاکستانی قوم کا اصل مسئلہ کیا ہے۔ کیونکہ دراصل ہمارے اور دوسری دینی جماعتوں کے درمیان اصل اور بڑا

فرق حالات کے تجزیئے ہی کا ہے۔ یہ بڑا آسان ہے کہ کسی ایک طبقے کو موردِ الزام ٹھہرا کر اور اپنے سمیت بقیہ پوری قوم کو بری کر دیا جائے' لیکن یہ حقائق سے چشم پوشی ہے۔ یہ حقیقت کا مُنہ چڑانے کے مترادف ہے۔اب ہمارا پاکستانیوں کا معاملہ کیا ہے؟ پاکستان کے بارے میں ہمارا تجزیہ درج ذیل ہے:

i) یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ پاکستان دوقومی نظریئے کی بنیاد پر وجود میں آیا تھا۔ ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ اسلام کے نام پر پاکستان بنانے کے بعد سے آج تک ہمارے دانشور اسی بحث میں الجھے ہوئے ہیں کہ پاکستان کی اساس و بنیاد کیا تھی؟ اس میں اسلام کا عنصر تھا یا نہیں تھا؟ سیدھی سی بات ہے کہ ہندو قوم کے مقابلے میں اپنے لئے دوقومی نظریئے کے حوالے سے علیحدہ ملک یعنی پاکستان کا مطالبہ کرنے والی قوم کا نام ''مسلمان'' تھا اور اس قوم نے جس نظریئے کی بنیاد پر الگ ملک کا مطالبہ کیا' وہ سوائے اسلام کے اور کوئی نہیں۔ اب اس بحث کو متنازعہ بنانا محض حقائق کو بدلنے کی کوشش اور جسارت کے سوا کچھ نہیں۔ چنانچہ یہ امر واقعہ ہے کہ برعظیم پاک و ہند کے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں نے رورو کے پاکستان کے لئے دعائیں مانگیں اور مسلم لیگ کی چوٹی کی قیادت نے ایک مثالی فلاحی اسلامی ریاست کو اپنی منزل اور قرآن حکیم کو اپنا دستور قرار دیا۔ مصور پاکستان علامہ اقبال نے تو پاکستان کا ایک آئیڈیا دیا تھا اور خوشخبری سنائی تھی۔ ۱۹۳۰ء میں انہوں نے خطبہ الٰہ آباد میں اپنا یہ الہام بیان کیا تھا کہ ہندوستان کے شمال مغربی حصے میں ایک آزاد اسلامی ریاست قائم ہو کر رہے گی۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جبکہ ابھی پاکستان کا لفظ بھی کسی نے نہیں سنا تھا' نہ ہی تجویز ہوا تھا۔ اس اسلامی ریاست کا رول انہوں نے احیائے اسلام کے حوالے سے معین کیا تھا کہ اس طرح مسلمانوں کو موقع ملے گا کہ عرب دورِ ملوکیت میں اسلام کے چہرے پر جو بدنما داغ اور دھبے پڑ چکے ہیں ان کو ہٹا کر دنیا کے سامنے صحیح اسلامی نظام کا نمونہ پیش کر سکیں۔ علامہ اقبال کے ان الفاظ کی تعبیر (interpretation) خلافت راشدہ کے نظام کے سوا کچھ نہیں ہو سکتی۔ پھر قائداعظم کے بیسیوں نہیں سینکڑوں بیانات اسی جانب

اشارہ کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہمارا دستور قرآن ہے' اور یہ کہ ہم پاکستان کی صورت میں ایک مثالی اسلامی فلاحی ریاست قائم کریں گے۔ گویا اللہ سے ہمارا یہ وعدہ تھا کہ اگر ہمیں ایک خطۂ زمین عطا ہو جائے تو اسے ہم ایک مثالی اسلامی ریاست اور اسلام کا قلعہ بنائیں گے۔

ii) لیکن قیام پاکستان کے بعد ہم مسلمانوں نے بحیثیت مجموعی اپنی اصل منزل یعنی اسلام کی طرف پیش قدمی کرنے اور ''دوقومی نظریئے'' کے لازمی منطقی تقاضے یعنی اسلامی تعلیمات اور اقدار کو ترویج دینے اور اسلام کے نظام عدلِ اجتماعی کو ملک میں نافذ و قائم کرنے کی بجائے انگریز کے چھوڑے ہوئے غیر اسلامی نظام کو ہر سطح پر تحفظ دیا' پاکستان کو آئیڈیالوجیکل اسلامک اسٹیٹ بنانے کی بجائے اسے سیکولر ریاست کے اصولوں پر پروان چڑھا کر دوقومی نظریئے کی خود ہی نفی کر دی' اور اپنی اصل منزل اور اللہ کے ساتھ کئے گئے وعدے کو بھول کر دنیا پرستی اور مفاد پرستی کی دوڑ میں شریک ہو گئے۔ نوائے وقت میں آج کل ''میں نے پاکستان بنتے دیکھا'' کے عنوان سے ان لوگوں کے تاثرات شائع ہو رہے ہیں جنہوں نے ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی طرف ہجرت کی تھی۔ جو لوگ مطالعہ کرتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ کیا جذبات تھے اُس وقت! یہاں پہنچ کر لوگ سجدۂ شکر ادا کرتے تھے کہ اب ہم دارالکفر سے ''دارالاسلام'' پہنچ گئے ہیں جہاں ہر سطح پر اسلامی اصولوں' اسلامی اقدار اور شریعت کی عملداری ہوگی۔ لیکن یہاں پہنچنے کے بعد سب باتیں بھول گئے۔ یہ ایک تلخ داستان ہے' مجھے اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ بات بالکل واضح ہے۔ ہندوستان میں ہندو اور انگریز دونوں کی غلامی ہمارے سر پر مسلط تھی' اللہ نے ہمیں اس سے نجات دلائی۔ اس دوہری غلامی سے آزادی ملنے کے بعد اللہ کا حق شکر ادا کرنے کے لئے بھی یہ لازم تھا کہ ہم مملکت خداداد پاکستان میں اللہ کے دین کو قائم اور اس کی عطا کردہ شریعت کو نافذ کرتے' لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔

iii) ہماری نااہلی اور غیروں کی عیاری کا نتیجہ یہ نکلا کہ قیامِ پاکستان کے چند سال

بعد ہی ملک شدید سیاسی انتشار کا شکار ہوا۔ غیروں کی عیاری سے مراد کیا ہے؟ ہمیں تو احساس نہیں تھا کہ پاکستان جو اسلام کے نام پر وجود میں آیا ہے' اس کی کیا معنویت اور significance ہے' لیکن ہمارے دشمنوں کو یہ معلوم تھا۔ یہود و نصاریٰ اسے بخوبی جانتے تھے۔ چنانچہ یہاں جو محلاتی سازشیں شروع ہوئیں وہ انہی کے ایما پر ہوئیں۔ اور ہم چونکہ دنیا داری میں مگن ہو کر اللہ سے کیا ہوا وعدہ بھول گئے لہٰذا ہم بڑی آسانی سے ان کا شکار ہوتے چلے گئے۔ ہم نے نفس پرستی اختیار کی تو شیطان اور عالمی شیطانی قوتیں ہم پر غالب آ گئیں۔ چنانچہ ہماری نااہلی اور غیروں کی عیاری کے نتیجے میں قیامِ پاکستان کے چند سال بعد ہی ملک شدید سیاسی انتشار کا شکار ہوا' جس کا نتیجہ بالآخر مارشل لاء کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ۱۹۵۶ء کا دستور جس میں قراردادِ مقاصد شامل تھی' کو روند کر فوج کو ۱۹۵۸ء سے ہی ہمارے سروں پر مسلط کر دیا گیا۔ لیکن میں پھر عرض کروں گا کہ اصل کوتاہی اور غفلت ہماری اپنی تھی جس سے دشمنوں نے فائدہ اٹھایا۔ گویا ملکی نظام کو صحیح رُخ پر چلانے کے لئے جن صحت مند سیاسی جمہوری اقدار کی ضرورت تھی' انہیں آہنی ہتھوڑے سے پاش پاش کر دیا گیا۔ شورائیت جیسی اصل جمہوری اقدار تو اسلام کی عطا کردہ ہیں' آج کل کی نام نہاد مغربی جمہوریت تو ایک فریب ہے۔ بقول اقبال ؎

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری!

اسی نام نہاد جمہوریت کی اصل حقیقت کو اقبال نے یوں بے نقاب کیا ہے ؎

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام؟
چہرہ روشن' اندروں چنگیز سے تاریک تر!

اصل جمہوری اقدار تو اسلام نے دی تھیں' ان اقدار کو آہنی ہتھوڑے سے پاش پاش کر دیا گیا۔ یہ پاکستان کا پہلا مارشل لاء تھا۔ واضح رہے کہ پاکستان کا وجود پہلے دن سے امریکہ کی گردن پر آسیب کی طرح سوار یہودی کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا

تھا۔ ملک کی سیاسی گاڑی کو دستور و آئین کی پٹڑی سے اتار کر فوجی آمریت مسلط کرنا یقینی طور پر امریکی سازش کا شاخسانہ تھا۔ یہی سازش آج اپنے نقطۂ عروج پر ہے اور یہود و نصاریٰ کا بھی گٹھ جوڑ آج روئے زمین سے اسلام ہی کو مٹانے کے درپے ہے۔ عالم اسلام میں پاکستان ان کے نزدیک بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ لہٰذا اُن کی خاص ''نظرِ عنایت'' ہم پر ہے۔ امریکہ نے ایک تیر سے دو شکار کئے ہیں۔ طالبان پر فوجی حملہ کیا اور ہمیں ایک دھمکی سے شکار کر لیا۔ چنانچہ ہم نے بلا تأمل امریکہ کی غلامی اختیار کر لی کہ تم جو چاہو گے ہم ویسے ہی کریں گے۔ بات ختم ہوگئی۔ ہم محکوم ہو گئے وہ حاکم ہو گیا۔ وہ فتح مند اور غالب ہے اور ہم مغلوب۔ عجیب طرفہ تماشا ہے کہ طالبان نے تو اب تک شکست تسلیم نہیں کی جبکہ ہم تو پہلے ہی دن سے شکست خوردہ ہیں۔

iv) نظریۂ اسلام سے بے وفائی' اللہ کے ساتھ کی گئی وعدہ خلافی اور کفرانِ نعمت کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اللہ کی رحمت ہم سے روٹھ گئی۔ اللہ کی رحمت کے بغیر ہمیں یہ ملک عطا نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ بات قائداعظمؒ نے بھی فرمائی ہے۔ ڈاکٹر ریاض علی شاہ نے ان کے ایامِ مرگ کے جو جملے نقل کئے ہیں ان میں یہ جملہ بھی ہے: ''اگر غیبی امداد اور رسولِ خدا کا خاص فیضان شامل حال نہ ہوتا تو پاکستان نہیں بن سکتا تھا''۔

اللہ کے ساتھ کی گئی وعدہ خلافی اور کفرانِ نعمت کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ کی رحمت ہم سے روٹھ گئی' بلکہ ہم اللہ کے عتاب کا شکار ہوئے' جس کے چند مظاہر حسب ذیل ہیں:

ا: یہ ملک پہلے سیاسی بحرانوں کی لپیٹ میں آیا اور پھر معاشی بحران بھی ہمارا مستقل مقدر بن گیا اور ہم عملاً آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے غلام بن کر رہ گئے۔ اس وقت جو دعوے کئے جا رہے ہیں کہ ہم نے کشکول توڑ دیا ہے' یہ محض ڈھکوسلہ ہے۔ بہت سے ماہرینِ معاشیات نے اس کا پوسٹ مارٹم کر کے بتایا ہے کہ یہ صرف الفاظ کی شعبدہ بازی ہے' اس کے سوا اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

ب: وہ ایک مسلمان قوم جس نے مل جل کر آزادی کی جدوجہد کی تھی' کئی قومیتوں میں بٹ گئی۔ اسلامی اخوت اور یگانگت کی جگہ صوبائی' علاقائی اور فرقہ وارانہ منافرت کی خاردار جھاڑیوں کی ہر چہار سو بھرمار ہوگئی۔ اس کی تفصیل

میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ پاکستان کی اصل منزل کو بھلانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ قوم بے مقصدیت کا شکار ہو گئی (ہماری منزل تو اسلام تھی' اور صرف اسلام ہی نہیں' Pan Islamism جس سے گاندھی خائف تھا)——— جس کا سب سے بڑا اور نہایت خوفناک مظہر یہ ہے کہ کئی قسم کے نظام ہائے تعلیم بیک وقت ملک میں رائج ہو گئے جو ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں باہم متصادم بھی ہیں۔ دنیا کے نقشے پر یہ عجیب قوم ہے کہ بیک وقت چار چار قسم کے نظام ہائے تعلیم چل رہے ہیں' ایک کا منہ کدھر ہے تو دوسرے کا کدھر۔ بے مقصدیت کا شکار اس قوم کی حیثیت بے لنگر کے جہاز یا کٹی ہوئی پتنگ کی ہو کر رہ گئی ہے۔

ج : تمام ملکی اور قومی ادارے بدترین زوال وانحطاط کا شکار ہوئے۔ یہ بھی سب کو معلوم ہے۔ اور آج بھی لوگ کہتے ہیں کہ انگریز کے دور میں نظام اچھا تھا۔ اس نے کچھ ادارے تو بنا دیئے تھے' جبکہ ع ''ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ!'' ہم نے ان ستاون سالوں میں کیا کیا ہے؟ ایک ایک ادارے کو تباہ کیا اور اسے اس کے منطقی زوال اور انحطاط کی آخری منزل تک پہنچا کر چھوڑا۔ نئی نسل کا پاکستان پر سے اعتماد اٹھ گیا۔ جب تعلیم ہی بے مقصدیت کا شکار ہے' ملک بے لنگر کا جہاز ہے' کوئی منزل معین نہیں ہے' اس کے اندر دانشوروں کی سطح پر confusion پیدا کی جا رہی ہے تو ظاہر بات ہے کہ پھر نئی نسل بے اعتمادی کا شکار ہوئی اور باصلاحیت افراد بڑے پیمانے پر پاکستان کو چھوڑ کر دیارِ غیر میں جا بسے۔ یہ ایک حقیقت اور امر واقعہ ہے جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

د : اللہ سے بدعہدی کی سزا یہ ملی کہ قومی سطح پر اخلاق و کردار کا دیوالیہ نکل گیا۔ ملی اور قومی مفاد کا تصور ذہنوں سے محو ہو کر رہ گیا۔ قومی مفاد کس چڑیا کا نام ہے یہ کسی کو معلوم نہیں۔ سرکاری ملازمت کا آج ایک ہی مطلب سمجھا جاتا ہے کہ اپنے اختیار کا ناجائز فائدہ اٹھانا اور ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں سستی' غفلت' نااہلی برتنا۔ تو ملی وقومی مفاد کا تصور ذہنوں سے محو ہوا۔ خودغرضی اور ذاتی مفاد پرستی قوم کا شعار بن گئی۔ کرپشن' جھوٹ' بددیانتی اور وعدہ خلافی کا زہر پوری قوم میں سرایت کر گیا۔ پوری قوم سے مراد اس میں ملوث صرف ایک طبقہ نہیں ہے کہ صرف اسے ہٹا دیا جائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا' بلکہ گنے چنے افراد کو

چھوڑ کر خواص وعوام سب اس میں شامل ہیں۔ پوری دنیا کے ممالک میں عالمی سطح پر کرپشن میں سیکنڈ highest پوزیشن ہم نے کس بنیاد پر حاصل کی ہے؟ ایک طبقے کی بنیاد پر یا پوری قوم کی بنیاد پر؟ کون ہے کہ جس کو موقع ملے اور وہ فائدہ نہ اٹھائے' ہاتھ نہ مارے؟ الا ماشاء اللہ! ہزاروں میں ایک یا لاکھوں میں ایک کا استثناء ہوسکتا ہے۔ سودی نظام کو دیکھ لیجئے۔ سود کے حوالے سے عوام کو اگر تشویش ہے تو صرف اس بات پر ہے کہ بینک اکاؤنٹ سے زکوۃ کیوں کاٹی جاتی ہے؟ یا اس بات پر ہے کہ سیونگ اکاؤنٹ پر منافع کی شرح کم ہوگئی ہے۔ اس پر کوئی تشویش نہیں ہے کہ ہم اپنا سرمایہ سیونگ اکاؤنٹ میں رکھ کر هنیئًا مّریئًا سود کھا رہے ہیں اور اللہ کے ساتھ بدترین بغاوت کا معاملہ کر رہے ہیں۔ اور اس حرام خوری کی وجہ سے نہ ہماری دعا قبول ہے' نہ نماز' روزہ اور حج قبول ہے' اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔ بتایئے یہ ایک طبقہ ہے یا پوری قوم ہے!

۶: اسلامی اقدار کو ترک کرنے کے اِس جرمِ عظیم کے نتیجے میں ہم اپنے تشخص کو ہی بھلا گئے۔ اقبال نے قریباً ایک صدی قبل جو بات کہی تھی ۔

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود!

آج ہم اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ بدتر حالت میں ہیں۔ اور اس جرم کا ارتکاب کس نے کیا ہے؟ ایک طبقے نے یا پوری قوم نے؟ واضح رہے کہ معدودے چند افراد کو چھوڑ کر قوم کے خواص وعوام کی ایک عظیم اکثریت دین سے بے وفائی کی مرتکب ہوئی ہے۔ یہ امر واقعہ ہے' یہ زمینی حقائق ہیں' ان کو نظر انداز کر کے ہم اپنی ہی منزل کھوٹی کریں گے اور اپنی ہی محنت اور کوشش کے نتائج کو بے ثمر بنائیں گے۔ چنانچہ پوری قوم پر اللہ کی طرف سے ذلت و مسکنت کا عذاب مسلط ہے۔

۷) ہمارے ہاں جمہوریت اور جمہوری اقدار کی بات بہت ہوتی ہے اور اس کے حوالے سے کبھی ایل ایف او اور کبھی وردی کا معاملہ زیر بحث آتا ہے' لیکن ہمارے ملک میں جمہوریت کی حقیقت ہے کیا؟ ایک سراب اور فریب کے علاوہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ۱۹۵۸ء سے لے کر آج تک ملک میں حقیقی جمہوریت

نہیں آ سکی۔ شاید کچھ لوگوں کے نزدیک گزشتہ ۵۷ سالوں میں چند ایک سال ایسے ہوں کہ جن کے دوران جمہوریت کچھ بہتر شکل میں تھی' ورنہ یہ پورا عرصہ یا تو فوج کی براہِ راست حکمرانی رہی یا فوج کے زیر سایہ اور تابع نمائشی جمہوریت کا ڈرامہ رچایا گیا۔ اور یہ ایک تلخ لیکن ناقابل تردید حقیقت ہے کہ بظاہر جمہوری ادوار میں بھی سیاسی لیڈروں اور سیاسی جماعتوں کو ہماری فوج نے ہمیشہ مہروں کی طرح استعمال کیا اور جب چاہا اس بساط کو الٹ دیا۔ اور ہمارے جمہوری اداروں کا بھی حال یہ ہے کہ جب کبھی ملک میں کوئی لولی لنگڑی جمہوری حکومت برسرِ اقتدار ہوتی ہے' تو بقیہ اپوزیشن والی جمہوری پارٹیاں فوج ہی کی طرف دیکھتی ہیں کہ وہ اس حکومت کا تختہ الٹے۔ یہ کون سی جمہوریت ہے؟ چنانچہ اصولی سیاست کی بجائے مفاد پرستانہ سیاست اور نمائشی جمہوریت ہی نے قومی شعار کا درجہ اختیار کر لیا۔ گویا فی الوقت ملک میں جمہوریت اور جمہوری اقدار کی حیثیت ایک سراب سے زیادہ نہیں ہے۔ اب تو پوری قوم امریکہ کی غلام بن چکی ہے' آپ کس جمہوریت کی بات کر رہے ہیں؟ اصل کام کی طرف آیئے اور جن قومی جرائم کی یہ سزا ہے' ان کے تدارک کی کوشش کیجئے!

یہاں میں اس بات کو اس کی منطقی انتہا تک پہنچانا چاہتا ہوں کہ یہ بھی ایک ناقابل تردید اور سنگین حقیقت ہے کہ ہماری فوج جو ۱۹۵۸ء سے لے کر آج تک ملک کے ایوانِ حکومت پر براہِ راست یا بالواسطہ قابض ہے' ہمیشہ ہر اہم معاملے میں وائٹ ہاؤس اور پینٹاگون کی طرف دیکھتی اور وہاں سے ہدایات اور راہنمائی حاصل کرتی رہی ہے۔ چنانچہ معین قریشی صاحب اچانک کون سے آسمان پر سے ٹپک پڑے تھے؟ انہیں اس ملک کا وزیراعظم نامزد کر دیا گیا جبکہ ان کے پاس پاکستان کا شناختی کارڈ بھی نہیں تھا۔ ان سطحی ڈراموں کے اندر الجھنے کی بجائے اصل اسباب اور اصل مرض کی طرف آیئے ـــــ جس کا نقطہ عروج اب یہ دور ہے جب امریکی مفادات کے تحفظ اور اسلام کے خلاف یہود و نصاریٰ کے ناپاک عزائم کی تکمیل میں ان کے معاون بن کر ہم اپنے بے شمار اہم ملّی اور قومی مفادات کی قربانی دے چکے ہیں اور ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ پھر

بھی ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ سب کچھ پاکستان کے مفاد میں کیا جا رہا ہے۔ ع ''ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے!''

گرہ بھنور کی کھلے تو کیونکر؟

اس ساری بات کا حاصل یہ ہے کہ جس تہہ در تہہ گرداب اور بھنور میں پاکستان اس وقت پھنسا ہوا ہے اس کی گرہ اُس وقت تک نہیں کھل سکتی جب تک ان اسباب کا تدارک نہ کیا جائے جو اِس ساری خرابی کا باعث ہیں۔ ہمارے تجزیے کی رو سے اس کا اصل سبب چونکہ نظریۂ پاکستان یعنی ''اسلام'' سے عمومی بے وفائی' جس کا ارتکاب خواص و عوام سبھی کی جانب سے ہوا ہے' اور اللہ کے ساتھ صریح بدعہدی اور ہمارا یہ اجتماعی جرم ہے کہ ہم نے اللہ کے عطا کردہ ملک پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام اور شریعت الٰہی کے نفاذ سے آج تک مجرمانہ غفلت برتی ہے۔ چونکہ یہ اصل اسباب ہیں لہٰذا اس گرہ کے کھلنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ ہم اپنے ان جرائم کا تدارک کریں۔ اس بھنور کی گرہ اس طرح کھلے گی اور معاملات اس طرح سلجھیں گے کہ قوم اجتماعی توبہ کرے اور اپنا قبلہ درست کرے۔ ہم نے اپنا تہذیبی قبلہ مغرب یعنی امریکہ اور یورپ کو بنالیا ہے' ہم اپنے بچوں کو مغربی اخلاق اور etiquettes سکھاتے ہیں اور اس پر فخر محسوس کرتے ہیں' اور اپنے بچوں کو تعلیم کے لئے وہاں بھیجتے ہیں۔ ہماری رسومات اور طرزِ معاشرت یا ہندوانہ ہیں یا مغربی! لہٰذا قوم اجتماعی توبہ کرے' اپنا قبلہ درست کرے اور اپنی اصل منزل یعنی اسلام اور اسلامی نظام کی طرف سنجیدگی سے پیش قدمی شروع کردے۔ اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ افراد اپنی زندگیوں میں اسلام اور اس کی اقدار کو رائج کریں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ہمارے رسول ﷺ نے زندگی کے ہر گوشے اور ہر معاملے میں تفصیلی راہ نمائی دی ہے اور اسوۂ کاملہ پیش کیا ہے تو اس کو ہم اختیار کیوں نہیں کرے؟ اگر واقعی اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان ہے تو اس کو اختیار کریں۔ یہ تو منافقت ہے کہ اللہ اور رسولؐ پر ایمان کا دعویٰ کریں اور زندگی کے تمام معاملات میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے دشمنوں کی طرف دیکھیں' ان سے راہ نمائی حاصل کریں اور

ان کی اقتداء کریں۔ افراد اپنی زندگیوں میں اسلام اور اسلامی اقدار کو رائج کریں' اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ہر ہر حکم کی اطاعت کو اوّلین ترجیح دیں' اسلامی تمدن اور شعار کو اپنائیں اور مل جل کر اس ملک میں غلبہ و اقامت دین کی جدوجہد کریں۔ یہی ہماری اصل منزل تھی یعنی خلافتِ راشدہ کی طرز پر ایک اسلامی فلاحی ریاست کا قیام۔ یہ واحد راستہ ہے جس پر عمل کے نتیجے میں ان شاء اللہ اس بھنور کی گرہ کھلنے کا آغاز ہوگا۔

یہ بات اگرچہ ناممکن تو نہیں ہے لیکن بہت مشکل ہے کہ پوری قوم اس راستے پر آئے۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو سب کو لے آئے' لیکن اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو اختیار دیا ہے اس کا چونکہ استعمال ہوتا ہے لہٰذا بادیٔ النظر میں پوری قوم تو نہیں آ سکتی' لیکن اگر قوم کا ایک قابل ذکر حصہ اپنی زندگیوں میں تبدیلی لانے پر آمادہ ہو جائے۔ کوئی نسبت تناسب تو ہو' یہ نہیں کہ چودہ کروڑ میں سے چند سو افراد اپنی زندگیوں کو ٹھیک اسی راستے پر لے آئیں' اس طرح قوم کی تقدیر نہیں بدل سکتی' لیکن اگر قوم کا ایک قابل ذکر حصہ اس راستے پر آ جائے تو نہ صرف یہ کہ اللہ کی روٹھی ہوئی رحمت ہمارے شامل حال ہو جائے گی' یعنی اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ وہ عذاب ٹل جائے گا جس کے ہم اِس وقت زیر سایہ ہیں' بلکہ اللہ کا پختہ وعدہ ہے کہ اس کی نصرت و حمایت بھی حاصل ہوگی' ازروئے الفاظ قرآنی: ﴿وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ﴾ (الحج:۴۰) اور ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ﴾ (محمد:۷) اور اگر اللہ کی مدد ہمارے ساتھ آ جائے اور وہ ہمارا پشت پناہ ہو تو دنیا تو کیا کائنات کی کوئی بڑی سے بڑی قوت بھی ہم پر غالب نہیں آ سکتی۔ ارشاد الٰہی ہے: ﴿اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ﴾ (آل عمران:۱۶۰) یہ ہے وہ راستہ جس کے لئے ہم کوشش کر رہے ہیں اور یہ ہمارا تجزیہ ہے جو میں نے پیش کر دیا ہے۔ جن کو یہ بات سمجھ میں آ جائے وہ افراد اس ایجنڈے پر کام شروع کر دیں۔ اسلام اور ایمان کے حقیقی تقاضے جو اللہ اور رسول ﷺ کی طرف سے ہم پر عائد ہوتے ہیں ہم ان پر عمل کرنا شروع کر دیں' جن کے حوالے سے اقبال نے کہا تھا کہ ؎

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا!

ہمیں اس راہ پر ایک مرتبہ آنا پڑے گا' ہمت کرنی ہوگی۔ ہاں یہ اللہ کا وعدہ ہے کہ تم ہمت کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اس راستے کو آسان کر دے گا۔ اگرچہ پورے گلوب پر فتنہ وفساد کا جو تسلط ہے اس میں یہ ہمت کرنا بھی آسان نہیں ہے' بہت مشکل ہے۔ لیکن اس ایک راستے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ لہٰذا افراد خود اپنا قبلہ درست کریں' اس پیغامِ قرآن کو عام کریں' لوگوں میں احساس ذمہ داری پیدا کریں' مسلمان ہونے کی حیثیت سے دینی ذمہ داریوں کا شعور اجاگر کریں۔ اور یہ سارا عمل ہوگا اس نہج پر جس پر محمد رسول اللہ ﷺ نے انقلاب برپا کر کے دکھا دیا۔ راہ نما اصول سب وہیں سے لینے ہوں گے۔ اور پھر جب ایک منظم قوت فراہم ہو جائے تو پھر ﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ﴾ کے مصداق اس قوت کو کوڑے کی شکل دے کر باطل نظام کی سرکوبی کے لئے استعمال کیا جائے۔ اگر لوگ اس کے لئے کمربستہ ہو جائیں تو اللہ کی مدد شامل حال ہوگی۔ ہم جن مصائب کا شکار ہیں' بے بسی ہم پر مسلط ہے' شیطانی اور ابلیسی قوتیں چڑھی آ رہی ہیں اور ہم بالکل ''ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم'' کی تصویر بنے ہوئے ہیں کہ ہم کچھ کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ ان حالات میں یہ راستہ اختیار کریں گے تو ان شاء اللہ کامیاب ہوں گے۔ اگرچہ بظاہر یہ راستہ لمبا اور مشکل نظر آ رہا ہے' لیکن قرآن وسنت اور سیرتِ مطہرہ کی روشنی میں یہی واحد قابل عمل راستہ ہے۔ اگر ایک قابل ذکر تعداد اس راستے پر آ جائے تو اس ملک کی تقدیر بھی بدلے گی اور پھر شاید یہیں سے اسلام کے عالمی غلبے کے مبارک عمل کا آغاز بھی ہوگا کہ ؎

میر عربؐ کو آئی ٹھنڈی ہوا جدھر سے
میرا وطن وہی ہے' میرا وطن وہی ہے!

ہمارا تمام دینی جماعتوں کو یہ پیغام ہے کہ ہماری ان معروضات پر غور کریں۔ دینی جماعتوں کے کرنے کا اصل کام ہے امر بالمعروف ونہی عن المنکر' اسلام کو ایجوکیٹ

کرنا' قرآنی تعلیمات کو عام کرنا' جھوٹ بولنے' حرام کھانے اور ایک دوسرے کی حق تلفی سے شدت کے ساتھ منع کرنا' اور منکرات کے مقابلے میں ڈٹ جانا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک سنہری موقع عطا کیا ہے۔ جمعہ کے اجتماعات میں اللہ تعالیٰ نے علماء کرام کو جو منبر عطا کیا ہے اس سے وہ بہت بڑا کام لے سکتے تھے' مگر افسوس کہ نہ لیا۔ پوری قوم کے جرائم میں یہ جرم بھی شامل ہے کہ ہم نے اس کا فائدہ نہیں اٹھایا۔ بعض دینی طبقات نے دین و مذہب کو محض پیٹ کا دھندا بنا کر دین کو بدنام کیا اور ہماری اکثر دینی جماعتیں ''الیکشن' ممبری' کرسی' صدارت'' ہی کے پھندے میں گرفتار ہو گئی ہیں۔ قوم کو ایجوکیٹ کرنا' انہیں مشکلات کے لئے تیار کرنا' ان کے اندر ایک پیاس پیدا کرنا کہ یہاں پر اسلامی نظام آئے' ربّ کی دھرتی پر ربّ کا نظام ہو' یہاں پر اللہ کی شریعت بالادست اور قائم و غالب ہو' اس کے لئے ایک جذبہ بیدار کرنا ـــــــ یہ عمل اس طور پر نہیں ہوا جو کہ اصل میں اہل دین کی ذمہ داری تھی۔ یہاں سے بات شروع کریں' پھر منظم ہوں' افراد کو آگے لے کر بڑھیں تو ان شاء اللہ اس راستے سے اس بھنور کی گرہ کھلنے کا آغاز ہو سکتا ہے۔ کوئی اور اس راستے پر آئے یا نہ آئے ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ جس راستے کو ہم نے اختیار کیا اس پر ہمیں استقامت عطا فرمائے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے اس سننے سنانے کو ہمارے لئے مفید اور دنیا و آخرت کے لئے کارگر اور ثمر آور بنا دے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العالمین

آہ! حاجی محمد اشرف صاحب بھی چلے گئے

تنظیم اسلامی پیرس کے امیر حاجی محمد اشرف مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم تنظیم اسلامی کے دیرینہ رفیق اور نہایت فعال کارکن تھے۔ عرصہ دراز سے مقامی امیر کے منصب پر فائز تھے۔ مرحوم انتہائی ملنسار اور خوش طبع تھے' ہر دم ایک دلکش مسکراہٹ ہر ملنے والے کو بھی خوشگوار کر جاتی۔ ایسی مسکراہٹ اب کہاں ملے گی؟

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ اُن کی لغزشوں سے درگزر فرماتے ہوئے انہیں جنت الفردوس عطا فرمائے اور لواحقین کو اس عظیم اور اچانک صدمے کی کیفیت میں صبر جمیل عطا فرمائے۔ رفقاء و قارئین میثاق سے اُن کے حق میں دعائے مغفرت کی اپیل ہے۔

مرتبۂ صِدّیقیت

اور

سیرتِ صِدّیقی' آئینۂ قرآن میں

تحریر: بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ

صِدّیق کا لغوی واصطلاحی مفہوم

سب سے پہلے ہمیں لفظ صِدّیق کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم متعین کر لینا چاہئے۔

صِدّیق کا لغوی مفہوم

لغوی اعتبار سے صِدّیق' صدق سے فِعّیل کے وزن پر مبالغے کا صیغہ ہے۔ گویا اس کے لفظی معنی ہوئے: پیکر صدق ووفا' سراپا راستی اور مجسم سچائی۔

سب جانتے ہیں کہ سیرت واخلاق کے جملہ محاسن میں صدق وراستی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ گویا یہ جملہ اوصافِ حسنہ کی اساس اور اُم ہے' جبکہ جھوٹ اور کذب کو اُم المعائب کا مقام حاصل ہے۔ وہ مشہور واقعہ بھی یقیناً آپ کو معلوم ہو گا کہ ایک شخص نے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ حضور! مجھ میں بہت سے بڑے بڑے عیب ہیں' لیکن میں ان سب کی بیک وقت اصلاح پر قادر نہیں ہوں' البتہ ان میں سے کوئی ایک' جو آپ فرمائیں' میں چھوڑ دوں گا۔ اس پر آنحضور ﷺ نے شراب نوشی اور بدکاری پر بھی ترکِ کذب کو مقدم رکھا۔ چنانچہ یہی ایک چیز اُس کی مکمل اصلاح کا ذریعہ بن گئی۔

صدق اور صادق کا مقام از روئے قرآن

قرآن حکیم کے مطالعے سے صدق کی جو عظمت سامنے آتی ہے اور یہ جس گھمبیر معنی اور وسیع مفہوم میں استعمال ہوتا ہے' اس کا کسی قدر اندازہ مندرجہ ذیل آیات سے ہوسکتا ہے۔

۱) سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ میں حقیقی مؤمن کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۝﴾

''مؤمن تو صرف وہ ہیں جو ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر' پھر شک نہیں کرتے' اور جہاد کرتے ہیں اپنی جانوں اور اموال کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔ حقیقت میں صرف یہی لوگ سچے ہیں!''

گویا از روئے قرآن ''مؤمن'' اور ''صادق'' ہم معنی الفاظ ہیں:

۲) سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷ میں نیکی کے ایک محدود مفہوم کی نفی اور نیکی کا حقیقی اور جامع تصور پیش کرتے ہوئے فرمایا:

﴿لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰى وَالْیَتٰمٰى وَالْمَسٰكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ۝﴾

''نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی جانب پھیر دو' بلکہ حقیقی نیکی اس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر' آخرت کے دن پر' فرشتوں پر' کتابوں پر اور انبیاء پر' اور دیا اس نے مال اس کی محبوبیت کے علی الرغم رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافر کو اور سائلوں کو اور گردنوں (کو آزاد کرانے) میں' اور قائم کی نماز اور ادا کی زکوٰۃ' اور نبھانے والے اپنے عہد کے جبکہ باہم کوئی معاہدہ

کر لیں' اور خصوصاً صبر کرنے والے فاقوں میں' تکلیفوں میں اور جنگ کے وقت۔ یہی ہیں وہ لوگ جو حقیقتاً سچے ہیں اور یہی ہیں صحیح معنوں میں متقی!''

گویا ازروئے قرآن نیکی' تقویٰ اور سچائی مترادف ہیں۔

۳) سورۃ الاحزاب کی آیت ۲۳ اور ۲۴ میں سچے مؤمنوں کی مدح میں فرمایا:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ......﴾

''اہل ایمان میں وہ جواں مرد بھی ہیں جنہوں نے سچ کر دکھایا اپنا وہ عہد جو انہوں نے اللہ سے کیا تھا۔ اُن میں وہ بھی ہیں جو اپنی نذر پیش کر چکے اور وہ بھی ہیں جو اِس کے منتظر ہیں' (بہر نوع) انہوں نے اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی' تا کہ اللہ بھر پور صلہ دے سچوں کو اُن کی سچائی کا......''

اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ سورۂ مریم (آیت ۵۴) میں جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

﴿اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ......﴾

''یقیناً وہ وعدے کا سچا تھا......''

تو یہ کتنی بڑی ستائش اور کیسی عظیم مدح ہے!

۴) سورۃ العنکبوت کے آغاز میں اہل ایمان کے لئے اللہ تعالیٰ کے مستقل ضابطۂ ابتلاء وآزمائش کی غرض وغایت بیان کرتے ہوئے ابتداءً فرمایا:

﴿فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۝﴾ (آیت ۳)

''اللہ یقیناً واضح کر کے رہے گا کہ کون سچے ہیں اور کون جھوٹے ہیں''۔

اور چند ہی آیات کے بعد پردہ بالکل اٹھا دیا اور واضح الفاظ میں فرما دیا:

﴿وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ۝﴾ (آیت ۱۱)

''اللہ یقیناً کھول کر رکھ دے گا کہ کون (واقعتاً) مؤمن ہیں اور کون (محض) منافق''۔

گویا ''صادق'' مؤمن ہے اور ''کاذب'' منافق!

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سورۃ التوبہ میں منافقین کے مفصل ذکر اور طویل زجر و توبیخ اور لعنت و ملامت کے بعد جب یہ فرمایا کہ:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ۝﴾ (آیت ۱۱۹)

''اے اہلِ ایمان! اللہ سے ڈرتے رہو اور سچے لوگوں کے زمرے میں شامل ہو جاؤ''۔

تو یہ کتنی جامع نصیحت ہے اور نفاق سے بچنے کی کتنی پُر زور تاکید!

''تصدیق بالحُسنیٰ''

''صدق'' اور ''صادق'' کے اس وسیع اور گھمبیر مفہوم کو ذہن میں رکھ کر مزید غور کیجئے تو یہ بات بالکل دو اور دو چار کی طرح یقینی نظر آئے گی کہ جو شخص خود سچا ہو' جس کا اپنا موقف راستی اور صداقت پر قائم ہو' یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ سچائی کا والہ و شیدا نہ ہو' یہاں تک کہ کوئی صداقت اس کے سامنے پیش کی جائے اور وہ اسے ردّ کر دے! ایسے شخص میں سچائی اور راستی کے لئے شدید حمیت پیدا ہو جانی لازمی ہے اور وہ ہر سچائی کو لپک کر قبول کرے گا اور ہر صداقت کی بڑھ کر تصدیق کرے گا اور اس راہ میں وہ نہ اپنی جھوٹی انا کو حائل ہونے دے گا نہ برخود غلط خودی کو' نہ کسی مصلحت کو آڑے آنے دے گا نہ کسی مفاد کو' نہ کسی خطرے کو خاطر میں لائے گا نہ اندیشے کو' نہ کسی سے کٹنا اسے گراں معلوم ہو گا نہ کسی سے جڑنا' نہ کوئی ''ترک'' اسے بھاری محسوس ہو گا' نہ ''اختیار'' نہ کوئی ''امر'' کٹھن نظر آئے گا نہ کوئی ''نہی'' — بلکہ صدق اور صداقت کے ساتھ اس کا خلوص اِن سب مراحل کو آسان بنا دے گا۔ گویا صدیق کے لئے لازم ہے کہ وہ ہر صداقت کی تصدیق پر ہر دم اور ہر آن آمادہ ہو۔ اور قرآن حکیم کے الفاظ میں ''تصدیق بالحُسنیٰ'' صدیقیت کا وصفِ لازم ہے۔

صدیق کا اصطلاحی مفہوم

چنانچہ علامہ آلوسی' صاحب تفسیر ''روح المعانی'' جب لفظ ''صِدّیق'' کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ:

اَلْمُتَقَدِّمُ فِی التَّصْدِیْقِ وَالْمُبَالِغُ فِی الصِّدْقِ وَالْاِخْلَاصِ فِی الْاَقْوَالِ وَالْاَفْعَالِ
''وہ شخص جو تصدیق میں پہل کرے اور خود اپنے اقوال و افعال میں حد درجہ سچا اور مخلص ہو۔''

تو فنی اعتبار سے یقیناً یہ ایک بہت جامع و مانع تعبیر ہے، لیکن حقیقت صدیقیت کی اتنی ہی جامع و مانع تعبیر موجود ہے قرآن حکیم کے ان حد درجہ مختصر لیکن انتہائی پُرشکوہ الفاظ میں کہ:

﴿وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِہٖ......﴾ (الزمر:۳۳)
''وہ شخص جو خود بھی صداقت پر قائم رہا اور ہر سچائی کی تصدیق بھی کرتا رہا!''

مرتبۂ صدّیقیت

حضراتِ مُنعَم علیہم کے مراتبِ چہارگانہ کے پس منظر میں

قرآن حکیم کی روشنی میں مرتبۂ صدیقیت کے تعین اور حضراتِ صدیقین کے اوصاف و خصائص کے تفصیلی مطالعے سے قبل یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ صدیقیت بھی نبوت اور رسالت کی طرح قرآن حکیم کی ایک مستقل اصطلاح ہے اور جس طرح نبوت ایک حقیقتِ معنوی ہے جس کا مصداقِ ظاہری خارج میں ہونا ضروری ہے اسی طرح صدیقیت کا مصداقِ خارجی بھی لازمی ہے۔

لہٰذا اگر کسی کے ذہن میں شعوری یا غیر شعوری طور پر ایسا کوئی خیال یا گمان موجود ہو کہ شاید صدیقیت ایک بعد کا گھڑا ہوا خطاب یا القاب ہے، جو محض خوش عقیدگی یا حسن ظن کی بنیاد پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو عطا کر دیا گیا تھا، تو اسے اس سے تائب ہونا لازم ہے، اس لئے کہ یہ ایک مغالطہ ہی نہیں، بہت بڑی گمراہی ہے اور حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ یعنی یہ کہ نبوت اور رسالت کی طرح صدیقیت اور شہادت بھی قرآن حکیم کی مستقل اصطلاحات ہیں اور جس طرح اوّل الذکر کے مصداق خارج میں موجود ہیں اسی طرح مؤخر الذکر کے مصداق بھی موجود ہیں، بلکہ جیسا کہ میں نے آغاز میں عرض کیا تھا، جس

طرح مقامِ نبوت اور مرتبۂ رسالت کا مظہر اَتم ہیں نبی اکرم ﷺ اسی طرح مقامِ صدیقی اور مرتبۂ صدیقیت کا مصداق کامل ہیں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ۔

منعم علیہم کے چار گروہ

اس سلسلے کی اہم ترین آیت سورۃ النساء کی آیت ۶۹ ہے جس میں نوعِ انسانی کے وہ خوش قسمت افراد جو انعام یافتہ یا مُنعَم علیہم کہلانے کے مستحق ہیں' چار گروہوں میں منقسم قرار دیئے گئے ہیں' یعنی: انبیاء کرام' صدیقین' شہداء اور صالحین۔ فرمایا:

﴿وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾

''اور جو اطاعت کرتا ہے اللہ اور اس کے رسولؐ کی تو انہیں معیت حاصل ہوگی ان کی جن پر اللہ نے انعام فرمایا' یعنی انبیاء' صدیقین' شہداء اور صالحین' اور بہت ہی اچھے ہیں یہ لوگ بحیثیت رفیق!''

یہ آیۂ مبارکہ اس اعتبار سے انتہائی اہم ہے کہ اس میں سورۂ فاتحہ کے ایک اجمال کی تفصیل ہے اور سورۂ فاتحہ ہماری سب سے بڑی عبادت یعنی نماز کا جزوِ لازم ہے' بلکہ ایک حدیثِ قدسی کی رو سے عینِ نماز ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کا خاتمہ ایک دعا پر ہوتا ہے جس میں ہم اپنے ربّ سے استدعا کرتے ہیں: ''اے ربّ ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت بخش!'' اور پھر اس سیدھے راستے کی مزید وضاحت کے ضمن میں عرض کرتے ہیں: ''ان لوگوں کے راستے کی جن پر تو نے انعام فرمایا...... الی الآخر'' —— یہاں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مُنعَم علیہم لوگ کون ہیں؟ اسی سوال کا جواب ہے جو سورۃ النساء کی محوّلہ بالا آیت میں دیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ یہ انعام یافتہ لوگ چار گروہوں پر مشتمل ہیں: انبیاء' صدیقین' شہداء اور صالحین۔

اس آیۂ کریمہ سے جہاں مُنعَم علیہم کی چار گروہوں میں تقسیم واضح ہوئی وہیں یہ بھی واضح ہوگیا کہ ان کے مابین ترتیب مراتب (۱) کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ نوعِ انسانی میں بلند

(۱) ع ''گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی!''

ترین مرتبہ و مقام کے حامل تو بلاشائبہ ریب و شک حضراتِ انبیاء ہیں' علیہم الصلوٰۃ والسلام۔ ان کے متصلاً بعد مقام اور مرتبہ ہے صدیقین کرام کا' ان کے بعد ہیں حضرات شہداء' اور سب سے آخر میں ہیں عام مؤمنین صالحین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔ گویا اس آیۂ کریمہ میں حضراتِ منعَم علیہم کا ذکر مرتبہ و مقام کے اعتبار سے نزولی ترتیب کے ساتھ کیا گیا ہے۔

نبوت اور صدیقیت

جہاں تک اس حقیقت کا تعلق ہے کہ مرتبۂ صدیقیت مقامِ نبوت کے متصلاً بعد اور اس کے بہت قریب واقع ہوا ہے' تو اس کی شہادت قرآن حکیم کے بہت سے دوسرے مقامات سے بھی حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً:

۱) قرآن حکیم میں حضرت مریم سلامٌ علیہا کو صراحتاً ''صدیقہ'' کا خطاب دیا گیا (المائدۃ:۷۵) اب اگر ان کے اس مقام اور مرتبہ کو پیش نظر رکھا جائے جو قرآن مجید کے ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ:

﴿یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰکِ وَطَھَّرَکِ وَاصْطَفٰکِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ﴾ (آل عمران:۴۲)

''اے مریم! اللہ نے تجھے چن لیا ہے اور تجھے پاک کر دیا ہے اور تجھے منتخب فرما لیا ہے تمام جہانوں کی خواتین میں سے''۔

اور دوسری طرف یہ حقیقت بھی سامنے رہے کہ نبوت کا دروازہ نوعِ انسانی کی صنف نازک پر بند رہا ہے تو یہ بات آپ سے آپ ثابت ہو جاتی ہے کہ بعد از نبوت افضل ترین مرتبہ صدیقیت کا ہے اور اعلیٰ ترین مدارج و مقامات صدیقین اور صدیقات کو حاصل ہیں!

۲) سورۂ یوسف میں مذکور ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے زنداں کے ساتھیوں نے ''صِدِّیق'' کہہ کر مخاطب کیا (یوسف:۴۶)۔ اب ظاہر ہے کہ یہاں دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو اسے صرف زنداں کے ان ساتھیوں ہی کا کلام قرار دیا

جائے۔اس صورت میں بھی اس عظیم حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ نبی کی شخصیت کا نمایاں ترین وصف ''صدق'' ہی ہے' اور جن لوگوں پر ابھی نبی کی نبوت منکشف نہیں ہوئی ہوتی وہ اسے ''صدیق'' ہی قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ خود نبی اکرم ﷺ کو قبل از اجرائے وحی اہل مکّہ نے ''الصادق'' ہی کا خطاب دیا تھا۔ یا دوسری صورت یہ ہے کہ یہ مانا جائے کہ زنداں کے ساتھیوں کا کلام اللہ تعالیٰ نے اپنے الفاظ میں نقل فرمایا ہے۔ اس صورت میں واحد ممکن تاویل یہ ہے کہ اُس وقت تک حضرت یوسف علیہ السلام پر وحیٔ نبوت کا اجراء نہیں ہوا تھا اور ابھی آنجناب صرف صدیقیت کے مقام پر فائز تھے۔ بہر صورت مقام صدیقیت اور مرتبۂ نبوت کا قرب اظہر من الشمس ہے!

۴) سورۂ مریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے دو جلیل القدر انبیاء یعنی حضرت ابراہیم اور حضرت ادریس علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا:

﴿اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا﴾ (آیات ۴۱'۵۶)

''بے شک وہ صدیق نبی تھا!''

جس سے معلوم ہوا کہ نہ صرف یہ کہ مقامِ صدیقیت اور مرتبۂ نبوت ایک دوسرے سے بہت قریب واقع ہوئے ہیں بلکہ صدیقیت نبوت کی تمہید ہے اور نبوت صدیقیت کی اگلی منزل!

صدیقین اور شہداء

منعم علیہم کے مراتب چہارگانہ میں سے نبوت تو ظاہر ہے کہ ہے ہی خالص وہبی' یعنی پہلے بھی صرف ذاتی قابلیت و صلاحیت اور محنت و ریاضت سے حاصل نہیں کی جا سکتی تھی' بلکہ جسے بھی ملتی تھی خالص عطیۂ الٰہی اور فضل خداوندی ہی کے طور پر ملتی تھی' اور اب تو اس کا دروازہ سرے سے ہی بند ہے' البتہ صدیقیت اور شہادت (۱) کے مراتب

(۱) واضح رہے کہ اس پوری بحث میں شہادت کا لفظ عام معروف معنوں میں استعمال نہیں ہوا' بلکہ قرآن حکیم کی ایک مخصوص اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ عجیب بات ہے کہ پورے قرآن مجید میں کسی ایک مقام پر بھی شہادت کا لفظ خدا کی راہ میں قتل ہونے کے معنی میں استعمال نہیں ہوا اور سوائے ایک مقام کے کہیں بھی شہید کے معنی مقتول فی سبیل اللہ نہیں لئے جا سکتے۔ وہ ایک استثنائی ←

عالیہ پہلے بھی کھلے تھے اور اب بھی نہ ''مقطوعہ'' ہیں نہ ''ممنوعہ'' بلکہ مؤمنین صالحین اپنی ہمت اور محنت کے مطابق اور مزاجِ شخصی و اُفتادِ طبعی کی مناسبت سے ان مراتب عالیہ تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ گویا بقول جگر ؎

پھول کھلے ہیں گلشن گلشن!
لیکن اپنا اپنا دامن!!

یہی وہ حقیقت ہے جو سورۃ الحدید کی آیت ۱۹ میں بیان ہوئی ہے اور جس کے بارے میں بہت سا قیل وقال صرف اس لئے ہوا کہ سیاقِ کلام اور ربط آیات پیش نظر نہیں رہا۔ چنانچہ جب سلسلۂ کلام سے صرفِ نظر کرتے ہوئے نگاہ صرف اس ایک آیت کے الفاظ پر مرتکز ہوگئی کہ:

﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ ۖ وَالشُّھَدَآءُ عِنْدَ رَبِّھِمْ ؕ﴾ (الحدید:۱۹)

''اور جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اُس کے رسولوں پر' تو یہی ہیں صدیق اور شہداء اپنے رب کے نزدیک''۔

تو ایک الجھن پیدا ہوگئی کہ اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ ہر مؤمن صدیق اور شہید ہے' جبکہ یہ بات بالبداہت غلط معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ اس اشکال کے حل کی کوششیں کی گئیں اور بہت سی آراء اور بے شمار اقوال کا ذخیرہ کتب تفسیر میں جمع ہو گیا' حالانکہ اگر سیاقِ کلام پر نگاہ رکھی جائے تو یہاں کوئی اشکال یا الجھن سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔

دراصل اس آیت کے صحیح فہم کے لئے اس سے پہلے کی تین آیات اور ان کے باہمی ربط کو سمجھنا ضروری ہے۔ وَھُوَ ھٰذَا:

آیت ۱۶ میں اہل ایمان (گویا عام مؤمنین صالحین) کو جھنجوڑا گیا ہے کہ کس تاخیر وتعویق میں پڑ گئے ہو اور کیوں قدم آگے نہیں بڑھاتے؟ اور متنبہ کیا گیا ہے کہ

← مقام سورۂ آل عمران کی آیت ۱۴۰ ہے اور یہاں بھی جہاں شہداء کے معنی مقتولین فی سبیل اللہ لینے کی گنجائش ہے وہاں اتنی گنجائش عام اصطلاحی معنوں کی بھی ہے۔ بہر حال اس بحث میں لفظ شہادت اپنے مخصوص اصطلاحی معنوں میں مستعمل ہے۔

مبادا تم بھی یہود کے مانند ہو جاؤ جن کے دل امتدادِ زمانہ سے سخت ہوتے چلے گئے اور اب ان کی اکثریت فساق و فجار پر مشتمل ہے۔ گویا یہ آیت زجر و تہدید اور تنبیہہ و ترہیب پر مشتمل ہے۔ آیت ۱۷ میں قرآن حکیم کے عام اسلوب کے مطابق ترغیب و تشویق کا اسلوب ہے اور حوصلہ بندھایا گیا ہے کہ اگر تم اپنے دلوں میں سختی محسوس کرو تب بھی مایوس مت ہونا! اللہ تعالیٰ جس طرح زمین کو مُردہ ہو جانے کے بعد حیاتِ تازہ عطا فرما دیتا ہے اسی طرح تمہاری کشتِ قلوب کو بھی حیاتِ نو عطا فرما دے گا اور تمہارے دلوں کی کھیتی پھر ایمانِ حقیقی کی ہری بھری فصل سے لہلہا اٹھے گی!

اگلی آیت میں گویا ''سلوکِ قرآنی'' کی وضاحت کر دی گئی اور اس عمل تزکیہ کی نشاندہی کر دی گئی جس سے کشتِ قلوب میں ایمان کی فصلِ تازہ کی امید کی جا سکتی ہے۔ یعنی یہ کہ اگر دلوں کی کھیتی میں تازہ بہار چاہتے ہو تو پہلے اس میں صدقہ و خیرات اور انفاق فی سبیل اللہ کا ہل چلاؤ اور حُبِّ دُنیا اور حُبِّ مال کی نجاستوں سے دلوں کو پاک کرو' اس لئے کہ اصل میں یہی تمہاری ترقی کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ اور تمہاری فطری استعدادات کے بروئے کار آنے میں سب سے بڑا مانع ہے۔

بعدہ آیت ۱۹ میں واضح فرما دیا کہ اگر یہ مورچہ تم نے سر کر لیا اور یہ منزل طے کر لی تو پھر کوئی رکاوٹ نہیں۔ اب ترقی کا راستہ بالکل کھلا ہے اور تم اپنی اپنی ہمت اور محنت کے مطابق اور اپنے اپنے مزاج اور اُفتادِ طبع کی مناسبت سے صدیقیت یا شہادت کے مراتب عالیہ تک رسائی حاصل کر سکتے ہو۔

گویا یہاں ربط کلام وہی ہے جو سورۃ البلد میں ہے۔ وہاں اسی مورچے یا منزل کو ایک دشوار گزار گھاٹی(۱) سے تشبیہہ دی گئی ہے اور نہایت تأسف اور حسرت کے پیرائے میں فرمایا گیا ہے کہ اگرچہ ہم نے انسان کو بے شمار ظاہری اور باطنی استعدادات سے نواز کر دنیا میں بھیجا' چنانچہ اسے ''عَيْنَيْنِ'' بھی دیئے اور ''لِسَانًا

(۱) پنجابی زبان کے ایک شاعر عبداللہ شاکر کی ایک طویل نظم کے ترجیعی بند کے یہ الفاظ اس مضمون کو خوب ادا کرتے ہیں کہ: ع اوکھی گھاٹی مشکل پینڈا عشق دیاں اسواراں دا!

وَّشَـفَتَيۡـنِ ‘‘ بھی‘ اور پھر درجہ بدرجہ نوعی‘ جبلی اور فطری ہدایتوں سے بھی نوازا‘ تا آنکہ ’’هَدَيۡنٰهُ النَّجۡدَيۡنِ ‘‘ کی منزل بھی طے کرادی‘ لیکن یہ کم ہمت اور تھڑ دلا اس گھاٹی میں نہ گھس پایا! جانتے ہو کون سی گھاٹی؟ ’’کسی گردن کا چھڑا دینا یا کھانا ہی کھلا دینا‘ قحط کے ایام میں‘ کسی یتیم کو جو قرابت دار بھی ہو یا مسکین کو جو خاک میں رُل رہا ہو!‘‘ (کاش کہ کر پاتا وہ اس گھاٹی کو عبور!) اور پھر جا شامل ہوتا اُن نفوسِ قدسیہ میں جو ایمان‘ تواصی بالصبر اور تواصی بالمرحمہ ایسے اوصافِ جلیلہ سے متصف ہیں ـــــ فرق صرف یہ ہے کہ سورۃ البلد میں درمیان میں کلمہ ’’ثُـمَّ ‘‘ آ گیا جس نے ربطِ کلام کو واضح کر دیا‘ جبکہ سورۃ الحدید میں اس کی جگہ پر صرف حرفِ عطف ’’و ‘‘ آیا جس سے ربطِ کلام قدرے مخفی ہو گیا!

بہر حال سورۃ الحدید کی آیت ۱۹ سے یہ حقیقت بھی ہر شک وشبہ سے بالاتر ہو کر ثابت ہو گئی کہ ’’صدیقین‘‘ اور ’’شہداء‘‘ قرآن حکیم کی مستقل اصطلاحات ہیں اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ یہی وہ بلند ترین مقامات ہیں جن تک اکتساباً رسائی ممکن ہے۔

مزاج اور اُفتادِ طبع کا فرق

اس معاملے میں مزید انشراحِ صدر کے لئے مناسب ہے کہ منعم علیہم کے مراتب چہارگانہ کے باہمی ربط وتعلق کو نفسیاتِ انسانی کی گہرائیوں میں اتر کر سمجھ لیا جائے اور طبائع کے فطری فرق اور مزاج و اُفتاد اور رجحانِ طبعی اور میلانِ نفسی کے فطری اختلاف کے حوالے سے قرآن حکیم کی ان چار اصطلاحوں کا گہرا فہم حاصل کر لیا جائے۔

ذرا دقتِ نظر سے مشاہدہ کیا جائے تو تمام انسان مزاجِ شخصی‘ اُفتادِ طبعی اور فطری رجحانات ومیلانات کے اعتبار سے دو گروہوں میں منقسم نظر آئیں گے:

ایک وہ نسبتاً خاموش‘ تنہائی پسند‘ ذہین‘ حساس‘ سنجیدہ اور متفکر المزاج لوگ‘ جو خارج کی دنیا سے زیادہ اپنے باطن میں مگن رہتے ہیں اور باہر کی دنیا اور اس کی دلچسپیوں سے زیادہ انہیں خود اپنے ہی دل ودماغ کی گہرائیوں میں غوطہ زنی محبوب ہوتی ہے۔ گویا وہ ’’تن کی دنیا‘‘ سے کہیں زیادہ ’’مَن کی دنیا‘‘ کے باسی ہوتے ہیں۔

اور دوسرے وہ خوش باش‘ بےفکرے‘ چست‘ فعال اور لاابالیانہ طبیعت کے حامل‘

بلکہ نٹ کھٹ قسم کے لوگ' جن کی اصل دلچسپی خارج کی دنیا سے ہوتی ہے اور وہ اس میں پوری طرح مصروف اور مگن رہتے ہیں! غور و فکر' سوچ بچار اور تفکر و اعتبار سے انہیں طبعاً کوئی مناسبت ہی نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس انہیں یا تو کھیل کود کا شوق ہوتا ہے' یا سیر و شکار کا یا شہ زوری اور پہلوانی کا!

پہلی قسم کے لوگوں کو نفسیاتِ جدیدہ کی اصطلاح میں entro-vert کہتے ہیں اور دوسری قسم کے لوگوں کو extra-vert۔ فطری طور پر پہلی قسم کے لوگوں کے قوائے فکریہ بہت مضبوط اور ترقی یافتہ (developed) ہوتے ہیں جبکہ قوائے عملیہ نسبتاً خوابیدہ (dormant) رہ جاتے ہیں' اور اس کے برعکس دوسری قسم کے لوگوں کے قوائے فکریہ دبے رہ جاتے ہیں جبکہ قوائے عملیہ پوری شان کے ساتھ نشوونما پاتے ہیں۔

ان دو کے علاوہ انسانوں کی ایک تیسری قسم جو بہت شاذ ہے' ان لوگوں پر مشتمل ہے جن کے قوائے فکری بھی نہایت بیدار اور ترقی یافتہ ہوتے ہیں اور قوائے عملیہ بھی پورے چاق و چوبند اور کامل نشوونما یافتہ ہوتے ہیں اور اِن دونوں کے مابین ایک حسین توازن بھی موجود ہوتا ہے۔ انہیں جدید نفسیات کی اصطلاح میں ambi-vert کہا جاتا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ اصلاً یہی لوگ حاصلِ نوعِ انسانی ہیں۔ ایسے لوگ اوّل تو ہوتے ہی بہت کم ہیں اور ان میں بھی وہ لوگ تو بالکل معدوم ہی کے حکم میں ہیں جن کے قوائے فکری و عملی میں کامل توازن موجود ہو! غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بھی کسی میں پہلا رنگ قدرے نمایاں تر ہوتا ہے اور کسی میں دوسرا۔

ان تینوں میں سے اعلیٰ ترین رتبہ تو ظاہر ہے کہ قسمِ ثالث کے لوگوں کا ہے۔ ان کے بعد نمبر قسمِ اوّل کے لوگوں کا ہے' اس لئے کہ انسان حیوانات سے ممتاز بہرحال اپنے قوائے فکری و عقلی ہی کی بنا پر ہے۔ اور تیسرے درجے میں دوسری قسم کے لوگ ہیں جو فعال تو اگرچہ بہت ہوتے ہیں لیکن غور و فکر اور سوچ بچار کم کرتے ہیں۔

حضراتِ منعم علیہم میں سے صدیقین پہلی قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور شہداء دوسری قسم کے۔

حضراتِ صدیقین ابتداء ہی سے طبع سلیم کے مالک ہوتے ہیں جو عبارت ہے عقل صحیح اور قلب سلیم دونوں کے مجموعے سے۔ چنانچہ ایک طرف ان کی اَخلاقی حس شروع ہی سے زندہ و بیدار ہوتی ہے اور نہ صرف یہ کہ خیر و شر' نیکی و بدی اور ظلم و جور اور عدل و انصاف کا فرق ان پر واضح رہتا ہے بلکہ ان کی طبیعت کا فیصلہ کن میلان جانب خیر اور سمتِ عدل و ادائے حقوق ہی میں رہتا ہے اور دوسری طرف اُن پر تعقل و تفکر کا غلبہ بھی ابتداء ہی سے ہوتا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جستجوئے حق اور اکتشافِ حقیقت کا ایک زوردار داعیہ اُن کے نفوس میں پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایک جانب ان کی عقل سلیم کتابِ فطرت اور صحیفۂ کائنات کے مطالعے سے حقائق کونیہ کے عین در پر جا دستک دیتی ہے تو دوسری جانب انہیں اپنے آئینۂ قلب میں حقیقت الحقائق کا دھندلا سا عکس بھی نظر آنے لگتا ہے ـــــ یہی وجہ ہے کہ جونہی کسی نبی کی دعوت ان کے کانوں میں پڑتی ہے' وہ والہانہ لبیک کہتے ہوئے دوڑ پڑتے ہیں اور انہیں بالکل ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا!
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا!

اس کے برعکس حضراتِ شہداء کے قلوب و اذہان پر ابتداءً ان کے رجحاناتِ طبعی اور میلاناتِ نفسی کے باعث ایک غلاف سا چڑھا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں نبی کی دعوت پر لبیک کہنے میں دیر لگ جاتی ہے۔ یہ تاخیر اصلاً تو صرف بے توجہی اور لااُبالی پن کے باعث ہوتی ہے لیکن ان میں سے بعض اپنے آبائی تعصبات کے باعث شروع میں نبی کی مخالفت اور مزاحمت میں حد درجہ سرگرم بھی ہو جاتے ہیں' پھر اُن کے قلوب و اذہان کا غلاف بھی اکثر و بیشتر کسی عقلی یا استدلالی اپیل سے نہیں بلکہ جذباتی انگیخت ہی سے پھٹتا ہے۔ لیکن پھر ہوتا یہ ہے کہ جیسے ہی اُس غلاف میں شگاف پڑتا ہے گویا سارا فاسد مواد ایک دم خارج ہو جاتا ہے اور دعوتِ حق کو قبول کرنے کے بعد جب وہ برسرِ عمل ہوتے ہیں تو اپنے فطری جوشِ عمل اور جذبۂ کار کے باعث بظاہر صدیقین پر بھی

بازی لے جاتے ہیں اور حضرت مسیح کے ان الفاظ کا مصداقِ کامل بن جاتے ہیں کہ: ''کتنے ہی ہیں جو بعد میں آتے ہیں لیکن اگلوں کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں!''—— یہ عرض کرنا تحصیل حاصل ہے کہ فرائض رسالت کی ادائیگی میں کم از کم بظاہر احوال حضراتِ شہداء ہی انبیاءِ کرامؑ کے اصل دست و بازو نظر آتے ہیں۔

کبار صحابہؓ میں سے حضرت ابوبکر اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہما صدیقیت کاملہ کی نہایت درخشاں مثالیں ہیں اور حضرت عمر اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما طبقۂ شہداء کی بہترین نمائندگی کرتے ہیں!

جہاں تک حضراتِ منعم علیہم کے چوتھے گروہ کا تعلق ہے، یعنی حضراتِ صالحین، تو یہ وہ عامۃ المؤمنین ہیں جن میں استعداد اور صلاحیت تو موجود ہوتی ہے لیکن ابھی اس کا کوئی نمایاں ظہور کسی خاص رُخ پر نہیں ہوا ہوتا۔ مزاج اور اُفتادِ طبع کے اعتبار سے ان میں پہلی دونوں ہی قسموں کے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ گویا ان میں بالقوۃ (potentially) تو صدیقین بھی ہوتے ہیں اور شہداء بھی ہوتے ہیں، لیکن ابھی وہ ترفع انہیں بالفعل (actually) حاصل نہیں ہوا ہوتا، البتہ اگر وہ اپنی ہمت کو مجتمع کر کے محنت کریں اور خصوصاً حُبِّ دنیا کی نجاست سے اپنے دل کو پاک کر لیں، جس کا سب سے بڑا علَم اور نشان (symbol) حُبِّ مال ہے، تو جیسا کہ سورۃ الحدید کی آیات ۱۶ تا ۱۹ اور سورۃ البلد کے حوالے سے مفصل بیان کیا جا چکا ہے، وہ اپنے مزاج اور اُفتادِ طبع کی مناسبت سے صدیقیت یا شہادت کے مراتب عالیہ تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ یعنی جن لوگوں کو بالفعل ترفع حاصل ہو جاتا ہے وہ اگر قسم اوّل سے تعلق رکھتے ہوں تو زمرۂ صدیقین میں شامل ہو جاتے ہیں اور اگر طبقۂ ثانیہ سے تعلق رکھتے ہوں تو حلقۂ شہداء میں شریک ہو جاتے ہیں۔ یہاں ضمنی طور پر یہ بھی سمجھ لیا جائے تو اچھا ہے کہ اہل تصوف کی اصطلاح میں پہلی قسم کے لوگ سالک مجذوب کہلاتے ہیں اور دوسری قسم کے لوگ مجذوب سالک!

رہے انبیاء کرام، تو اگرچہ نبوت ایک خالص وہبی اور عطائی ملکہ ہے اور اللہ جسے

چاہے یہ نعمت عظمیٰ عطا فرما دے' تاہم بمصداقِ آیۂ قرآنی: ﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسٰلَتَهٗ﴾ (الانعام:۱۲۴) ''اللہ بہتر جانتا ہے کہاں رکھے اپنی رسالت!'' ان کا انتخاب قسم ثالث کے لوگوں ہی میں سے ہوتا ہے جن کی عقلی وفکری قوتیں بھی انتہائی بلندیوں کو چھو رہی ہوتی ہیں اور فعل وعمل کی قوتیں بھی پورے جوبن پر ہوتی ہیں اور پھر ان دونوں کے مابین ایک حسین توازن بھی موجود ہوتا ہے۔ گویا ہر نبی اپنے مزاج کے اجزائے ترکیبی کے اعتبار سے صدیق بھی ہوتا ہے اور شہید بھی۔ اگرچہ ان دونوں اجزائے ترکیبی کی کسی ذات واحد میں بیک وقت بتمام وکمال موجودگی حد درجہ شاذ بلکہ حقیقتاً کالمعدوم کے حکم میں ہے۔ چنانچہ جن انبیاء ورُسل کے حالات تفصیل سے معلوم ہیں ان میں ان دونوں قوتوں کی بیک وقت بتمام وکمال موجودگی اور پھر ان کے مابین کامل توازن کی مثال تو ایک ہی ہے اور وہ ہے ذاتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔ باقی حضرات بھی اگرچہ اپنے اپنے مقام پر نہایت جامع الصفات شخصیتوں کے مالک ہیں' تاہم کسی میں رنگ صدیقیت نمایاں تر ہے' جیسے حضرت ادریس' حضرت ابراہیم اور حضرت یوسف اور کسی میں رنگ شہادت زیادہ نمایاں ہے' جیسے حضرت نوح' حضرت اسمٰعیل اور حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام۔

نبوت ورسالت

یہاں اس حقیقت کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ نبوت اور رسالت دو مختلف یا علیحدہ چیزیں نہیں ہیں' بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو پہلو اور ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ یہ بات تو صد فی صد درست ہے کہ نبوت عام ہے اور رسالت خاص' یعنی ہر رسول تو لازماً نبی بھی ہوتا ہے لیکن ہر نبی لازماً رسول نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ حقیقت بھی صد فی صد صحیح ہے کہ منکرین اور مخالفین پر فیصلہ کن غلبے کا وعدہ بھی صرف رسولوں سے ہے' انبیاء سے نہیں۔ لیکن جس کسی نے یہ سمجھا ہے کہ رسالت مرتبہ ومقام کے اعتبار سے نبوت سے بلندتر ہے' اسے یقیناً مغالطہ ہوا ہے۔

نبوت اور رسالت کے باہمی تعلق کو سرسری طور پر تو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ نبوت

ایک حیثیت یا رتبہ (class or cader) ہے اور رسالت ایک عہدہ یا منصب (position or appointment) ہے۔ جیسے مثال کے طور پر سی ایس پی ایک حیثیت یا رتبہ ہے اور کسی ضلع کی ڈپٹی کمشنری ایک عہدہ یا منصب ہے' جس کسی نے سی ایس پی کا امتحان پاس کر لیا اس کی ایک حیثیت متعین ہوگئی۔ یہ مثال ہے نبوت کی۔ اور جب اس کی تعیناتی کسی ضلع کے ڈی سی کی حیثیت سے ہوگئی تو یہ ایک منصب ہے جو اُسے ملا۔ یہ مثال ہے رسالت کی[1]۔ اب ظاہر ہے کہ اصل اعتبار حیثیت کا ہے جو مستقل ہے نہ کہ منصب کا جو بدل بھی سکتا ہے۔

اور اگر اسی حقیقت کو مزید گہرائی میں سمجھنا ہو تو اہل تصوف کی اصطلاحات سے مدد لینی ہوگی۔ نبوت مرتبۂ عروج میں ہے' اور محیط ہے سیر الی اللہ اور سیر فی اللہ دونوں کو جبکہ رسالت مرتبۂ نزول میں ہے اور عبارت ہے سیر عن اللہ الی اللہ سے۔ گویا نبوت کا اصل رُخ خدا کی جانب ہے اور یہ معراج ہے حیثیت عبدیت کی' اور اس کے متصل واقع ہے مقامِ صدیقیت' جب کہ رسالت کا اصل رُخ خلق کی جانب ہے اور اس کے قریب تر ہے مرتبۂ شہادت۔ مزید واضح الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ صدیقیت ظل ہے مقامِ نبوت کا اور شہادت ظل ہے مرتبۂ رسالت کا!

رسالت اور شہادت

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں رسالت اور شہادت کا ذکر اکثر لازم وملزوم کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ جیسے:

۱) ﴿اِنَّا اَرْسَلْنَا اِلَیْکُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَیْکُمْ......﴾ (المزمل:۱۵)
''ہم نے بھیج دیا ہے تمہاری طرف ایک رسول تم پر گواہ بنا کر۔''

۲) ﴿اِنَّا اَرْسَلْنٰکَ شَاهِدًا......﴾ (الاحزاب:۴۵)
''ہم نے بھیجا ہے تمہیں گواہ بنا کر''۔

---

(۱) یہی رمز ہے سورۂ احزاب کی اس مشہور آیت کے اسلوبِ خطاب میں کہ ﴿یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّا اَرْسَلْنٰکَ شَاهِدًا......الآیۃ﴾

۳) ﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ﴾(الحج:۷۸)
''تاکہ ہو جائے رسول گواہ تم پر!''

۴) ﴿وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ (البقرۃ:۱۴۳)
''اور ہو جائے رسول تم پر گواہ۔''

گویا بعثت رُسل کی اصل غرض و غایت بھی شہادت ہے اور کارِ رسالت کی نسبتِ باطنی بھی شہادت ہی کی جانب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا' فرائض رسالت کی ادائیگی میں انبیاءِ کرام کے اصل دست و باز و حضرات شہداء ہی بنتے ہیں۔

اور یہیں سے سمجھ میں آ سکتا ہے تفسیر و تاویل قرآن کا وہ غامض نکتہ کہ کیوں سورۂ مریم میں دو جلیل القدر انبیاء کو تو' جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ''صِدِّيْقًا نَّبِيًّا'' قرار دیا گیا اور دو ہی کو ''رَسُوْلًا نَّبِيًّا'' کہا گیا۔ قرآن حکیم میں کوئی لفظ بے معنی نہیں اور کوئی ترکیب خالی از حکمت نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم ہی سرسری طور پر گزر جائیں اور ''علاجِ تنگیٔ داماں'' سے صرفِ نظر کر کے صرف ''چند کلیوں پر قناعت'' کی روش اختیار کر لیں۔ بات بالکل واضح ہے کہ جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا' حضرت ادریس اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے مزاج میں رنگ صدیقیت نمایاں ہے۔ گویا ان کا انتخاب صدیقین کے زمرے میں سے ہوا تھا' لہٰذا وہ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا قرار پائے' اور حضرت اسماعیل اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے مزاج میں رنگ شہادت نمایاں تر ہے جو اَقرب اور اَنسب ہے مرتبۂ رسالت سے' پس وہ رَسُوْلًا نَّبِيًّا قرار پائے۔ گویا:۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیو!
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

☆☆☆

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجئے۔

صدر مملکت، وزیر اعظم پاکستان اور وفاقی وزیر داخلہ سے مطالبہ

پاسپورٹ میں مذہب کا خانہ بحال کیا جائے

قادیانیوں کو

- ۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کو آئین پاکستان میں دوسری متفقہ ترمیم کے ذریعہ غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا۔
- ووٹر لسٹوں، پاسپورٹ وشناختی کارڈ کے فارموں میں ختم نبوت کا حلف نامہ رکھا گیا۔
- پاسپورٹ میں مذہب کے خانہ کا اضافہ کیا گیا۔

ربع صدی سے پاکستان کے تمام حکومتی ادوار میں اس پر عمل درآمد ہوتا رہا۔
موجودہ دور حکومت میں قادیانیوں کی سازش سے ووٹر لسٹوں سے حلف نامہ حذف کیا گیا۔ اور پھر اسلامیانِ پاکستان کے اضطراب واحتجاج کے باعث اسے وفاقی حکومت نے واپس لیا۔

- اب پھر حکومتی دوائر میں قادیانی لابی نے شب خون مار کر پاسپورٹ سے مذہب کا خانہ حذف کرا دیا ہے۔ حالانکہ یہ آئینی طور پر طے شدہ مذہبی وقومی مسئلہ تھا، جسے اب متنازعہ بنا کر اسلامیانِ عالم کو اضطراب اور اسلامیانِ پاکستان کو امتحان میں مبتلا کر دیا گیا ہے۔
- پاسپورٹ میں مذہب کا خانہ جہاں آئینی تقاضا تھا وہاں اس لئے بھی ضروری تھا کہ قادیانی بوجہ غیر مسلم ہونے کے حدودِ حرمین شریفین میں داخل نہیں ہو سکتے۔ سعودی عرب حرمین شریفین میں قانونی طور پر شاہ فیصل مرحوم کے دور سے ان کا داخلہ بند ہے۔ پاکستان میں دیگر ممالک کی نسبت قادیانی تعداد زیادہ ہے۔ پاسپورٹ میں مذہب کا خانہ نہ ہونے کے باعث دھوکہ دہی سے وہ مسلمان بن کر حرمین شریفین چلے جاتے ہیں۔ اب مذہب کے خانہ کو پاسپورٹ سے حذف کر کے قادیانیوں کی چال اور دھوکہ دہی کو کامیاب بنانے کی حکومتی سطح پر نامناسب کوشش کی گئی ہے۔
- صدر مملکت، وزیر اعظم، وفاقی وزیر داخلہ، قادیانی لابی کی ناز برداری اور پرورش کی روش ترک کر کے پاسپورٹ کے فارم میں حلف نامہ اور پاسپورٹ میں مذہب کے خانہ کو حسب سابق فوری بحال کرنے کا آرڈر جاری کریں۔

آل پارٹیز مرکزی مجلس عمل تحفظ ختم نبوت پاکستان ملتان

تہذیبی کشمکش اور مسلم نفسیات

تحریر: سید قاسم محمود

امریکی دانشور اور مصنف سیموئیل پی ہنٹنگٹن نے اپنی کتاب ''تہذیبوں کا تصادم'' (Clash of Civilizations) لکھنے سے پہلے اپنے ایک ہم وطن دانشور ہنری کسنجر کا ایک قول پڑھ رکھا تھا جو اُس نے سرد جنگ کے زمانے میں لکھا تھا کہ ''اکیسویں صدی میں بین الاقوامی نظام چھ طاقتوں پر استوار ہوگا یعنی امریکہ' یورپ' چین' روس اور ممکن ہے کہ انڈیا''۔ مصنف نے جب قلم اٹھایا تو سرد جنگ ختم ہو چکی تھی اور اکھاڑے میں صرف امریکہ دندناتا رہ گیا تھا۔ اب مقابلہ تو بہرحال کسی نہ کسی سے کرانا تھا' اس لئے مصنف نے ''طاقتوں'' کا لفظ مصلحتاً کاٹ کر لفظ ''تہذیبیں'' رکھ دیا' اور مذکورہ چھ تہذیبوں کو پٹی پٹائی ثابت کرنے کے لئے اس نے کہا کہ:

> ''ان چھپن ریاستوں کو نہیں بھولنا چاہئے جو بیشک الگ الگ تاریخ' جغرافیہ' زبان' ثقافت اور تمدنی روایات رکھتی ہیں' لیکن اسلام کی رسی میں بندھ کر بلائے جان بن سکتی ہیں۔ پس چونکہ مسلمان دنیا کو ''دارالامن'' اور ''دارالحرب'' میں بانٹتے ہیں' اس لئے امریکی دانشوروں کو بھی دنیا کو ''امن کے علاقوں'' اور ''حرب وضرب کے علاقوں'' میں تقسیم کر لینا چاہئے''۔

مصنف بڑا دانا اور زیرک ہے۔ گزشتہ تین ہزار سال کے دوران میں ابھرنے اور ڈوبنے والی تہذیبوں کے عروج وزوال کی تاریخ اور ان کی باہمی کشمکش کی داستان پر اُس کی نظر بہت گہری ہے' اور اسی لئے وہ دُور اندیش بھی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ انسانی تاریخ میں کوئی ایسا خالی وقت نہیں آیا جب دو تہذیبیں ایک دوسرے سے متصادم نہ رہی ہوں اور طاقتور تہذیب نے کمزور تہذیب کو ملیامیٹ نہ کیا ہو' اور طاقتور سے طاقتور تہذیب خواہ کتنی بھی بلندی پر گئی ہو' ایک نہ ایک دن گری ضرور ہے۔ پس مغربی تہذیب بھی ایک نہ ایک دن ضرور گرے

گی' لیکن اس تہذیب کو موجودہ عروج مسلسل ساڑھے پانچ صدیوں کی سخت کاوشوں کے بعد حاصل ہوا ہے' اس لئے اسے زوال آتے آتے بھی پوری ایک صدی لگ جائے گی۔ چنانچہ اکیسویں صدی پر تو لازماً مغرب کی برتری قائم رہے گی اور اگر وہ بائیسویں صدی میں خود کو برقرار رکھنا چاہے تو اس کی بنیادی ذمہ داری مغربی تہذیب کے موجودہ اجارہ دار امریکہ پر عائد ہوتی ہے۔ امریکہ مغربی تہذیب کے تحفظ اور اس کے عرصۂ زوال کو زیادہ سے زیادہ طول دینے کے لئے مندرجہ ذیل آٹھ تدابیر پر سختی سے عمل کرے:

۱) یورپ کے ساتھ سیاسی' معاشی اور عسکری روابط کو وسعت دے۔
۲) دوسرے ملکوں کے باہمی اختلافات سے فائدہ اٹھانے کے لئے اپنی پالیسیوں کو مربوط بنائے۔
۳) یورپی یونین اور نیٹو کو زیادہ سے زیادہ وسعت دے۔
۴) لاطینی امریکہ کو جدیدیت کے رنگ میں مزید رنگا جائے اور اس میں شامل ملکوں کو یورپی ممالک کے قریب لا کر ان میں سیاسی و معاشی اتحاد پیدا کیا جائے۔
۵) مسلم ملکوں اور چین کی روایتی اور غیر روایتی فوجی طاقت کی ترقی میں ہر ممکن طریقے سے رکاوٹیں ڈالی جائیں۔
۶) جاپان کے مغرب سے دُور ہونے اور چین سے قریب ہونے کے رجحان کو سختی سے روکا جائے۔
۷) روس کو آرتھوڈوکس عیسائیت کی مرکزی ریاست تسلیم کر لینا چاہئے۔
۸) دوسری تہذیبوں پر امریکی تہذیب کی فوجی اور تکنیکی برتری کو برقرار رکھا جائے اور فوجی مقابلے کی دوڑ میں کسی اور تہذیب کو اپنے سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔

امریکہ کے اس محبِ وطن دانشور نے یہ آٹھ تجاویز دے کر گویا امریکی عوام اور حکومت کے سامنے اکیسویں صدی کا لائحہ عمل پیش کر دیا ہے' جس سے اتفاق کرنا کسی کے لئے ضروری نہیں۔ اتفاق نہ سہی' مگر رنجش ضرور پیدا ہوتی ہے' خصوصاً اس وقت جب وہ دانشوری کی کرسی سے اتر کر پادری کا روپ دھار لیتا ہے اور لفظ ''تہذیب'' کو مذہب کے ہم معنی قرار دے کر اعداد و شمار کی صورت میں یا طنزیہ پیرائے میں اسلام اور مسلمانوں پر نکتہ چینی کرتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے:

''عیسائیت کا فروغ صرف تبدیلیٔ مذہب سے ہوتا ہے' جبکہ اسلام دوہری وجوہ سے

پھیلتا ہے' تبدیلیٔ مذہب سے بھی اور زیادہ شرحِ پیدائش کی وجہ سے بھی' جو کثرتِ ازدواج کا نتیجہ ہے۔اس حساب سے ۲۰۲۵ء تک مسلمانوں کی آبادی پوری دنیا میں سب مذاہب سے زیادہ ہو جائے گی''۔

فاضل مصنف نے بڑی قابلیت سے چار سو صفحات کی کتاب میں فروغ اسلام کی تیسری وجہ کی طرف اشارہ تک نہیں ہونے دیا۔ یہ اعتراف کرنے پر تو وہ مجبور تھا کہ جو مذہب مغرب میں سب سے زیادہ پھیل رہا ہے' وہ اسلام ہے۔ یہ نہیں بتایا کہ اہل مغرب اگر اسلام قبول کر رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مغربی تہذیب کے کھوکھلے پن اور نری مادیت سے گھبرا کر جب کسی بہتر' سادہ اور قابل عمل عقیدے کی جستجو کرتے ہیں تو وہ اسلام کے سوا انہیں کہیں اور نظر نہیں آتا۔

مصنف اسلامی نظامِ ریاست کو مغربی طرزِ حکومت سے نیچا دکھانے کے لئے الٹی دلیل دیتے ہوئے لکھتا ہے:

''پوری انسانی تاریخ میں مذہب اور ریاست علیحدہ ہوا کرتے تھے۔ چرچ اور ریاست کی دوئی مغربی تہذیب کی اہم خصوصیت ہے' لیکن عجیب بات ہے کہ اسلام مذہب اور ریاست کی یکجائی پر زور دیتا ہے''۔

وہ اپنے ہم خیال ایک دوسرے مغربی مفکر پائپس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے مسلمانوں کو تلقین کرتا ہے:

''اسلام کے پاس کوئی دوسرا انتخاب نہیں ہے۔ جدیدیت کے حصول کے لئے مغربیت کو اختیار کرنا پڑے گا۔ اسلام جدیدیت کا کوئی متبادل پیش نہیں کرتا۔ سیکولر ازم سے بچنا ناممکن ہے۔ جب جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کو اختیار کیا جاتا ہے تو اس فلسفے کو بھی ماننا پڑتا ہے جو جدید سائنس اور ٹیکنالوجی سے جڑا ہوا ہے۔ حکومتی اور سیاسی اداروں کا معاملہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔ اگر مغربی تہذیب سے کچھ سیکھنا ہے تو اس کے غلبے اور برتری کو بھی ماننا ہوگا۔ یورپی زبانوں اور مغربی تعلیمی اداروں سے گریز ممکن نہیں۔ جب تک مسلمان مغربی ماڈل کو واضح طور پر اور صدق دل سے قبول نہیں کریں گے وہ نہ تو ٹیکنالوجی حاصل کر سکتے ہیں اور نہ شاہراہِ ترقی پر گامزن ہو سکتے ہیں''۔

مسلمانانِ عالم کے لئے ایسا درشت اور توہین آمیز لب ولہجہ اختیار کرنے کی ضرورت اہل مغرب کو اس لئے پیش آتی ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعی نفسیات ساڑھے پانچ سو سال کے دوران میں شدید قسم کے احساسِ کمتری میں مبتلا ایسے مریض کی سی ہو کے رہ گئی ہے جس پر اب

کوئی میڈیسن اثر نہیں کرتی۔ دنیا جہان سے بیزار' افیونی طبیعت' کاہل' ست الوجود' اپنے حال میں مست' اپنی تقدیر پر شاکر' جو ہونا ہے ہو کر رہے گا' وحدت الوجود کا ایسا قائل کہ اپنے ارادے سے پلک جھپکنے کو بھی گناہ خیال کرے۔ مصنف اپنی مغربی تہذیب کا عرصۂ زوال ایک صدی بتاتا ہے' جبکہ مسلم نفسیات کو زوال پذیری کے جھٹکے سہتے سہتے ساڑھے پانچ سو سال ہو گئے ہیں۔

وہ کون سی حد فاصل ہے جہاں سے امت مسلمہ کا زوال اور ان کے مدمقابل مغربی طاقتوں کا عروج شروع ہوا؟ تواریخ میں وہ سال فتح قسطنطنیہ کا سال یعنی ۱۴۵۳ء لکھا ہے۔ کیوں لکھا ہے؟ اس کا جواب اس مضمون کے مطالب سے باہر ہے۔ صرف اتنا جاننا کافی ہے کہ اسی سال سے جدیدیت کا آغاز ہوا تھا۔ مفتوح قوم نے اپنی شکست کے اسباب کا صحیح تجزیہ کیا۔ غیر ضروری مابعد الطبیعیات' غلط مذہب اور پاپائیت کے سخت گیر احتسابی نظام کو مسترد کر کے عقلیت اور تجربیت کا راستہ اختیار کیا۔ پہلے احیائے علوم اور اس کے کچھ عرصہ بعد اصلاحِ مذہب کی کامیاب تحریکوں نے اس کے راستے کو آسان' منزل کو واضح اور ترقی کی رفتار کو تیز کر دیا۔ چار سو سال کی مسلسل اور سخت جانفشانی کے بعد بیسویں صدی مکمل طور پر اہل مغرب کی صدی تھی۔ ذہن و نفس کی دنیا پر وہ سگمنڈ فرائیڈ کے ذریعے' حیاتیات کے شعبے میں ڈارون کی وساطت سے اور طبعی کائنات پر وہ آئن سٹائن کے بدست' بلا شرکت غیرے حکمرانی کرتے رہے۔ جوہری توانائی کا انکشاف' جس کے نتیجے میں ایٹم بم' ٹیلی ویژن' مواصلاتی سیارے' چاند کی تسخیر' مریخ کی مٹی کھرچ کر کیمیائی تجزیے کے لئے زمین کی لیبارٹری میں لانا' کمپیوٹر اور سوپر کمپیوٹر' اور لاتعداد گھریلو و دفتری اشیاء کی محیر العقول ایجادات صرف اور صرف اہل مغرب کی تحقیق و محنت کے ثمرات ہیں' جن سے مسلمانانِ عالم اپنے اسلاف کی میراث سمجھ کر استفادہ کر رہے ہیں' اور بیچاری مسلم نفسیات حیرت کدے کے ایک گوشے میں کھڑی' حیران و پریشان' ہمہ وقت گنگناتی رہتی ہے:

محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!

اُدھر مغرب میں تو سیکولرازم کی اسکرین کے پیچھے عیسائیت صہیونیت کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر روز افزوں ترقی کے مراحل یکے بعد دیگرے طے کرتی گئی' اور اِدھر مسلم نفسیات حیرتی بن کر اپنے باطن کے نہاں خانے میں خلوت نشین ہو گئی۔ ترکِ دنیا میں عافیت جانی' دین کو دنیا سے الگ کر کے موت کو زندگی پر فائق کر لیا۔ اللہ اکبر کی جگہ اللہ ھو اللہ ھو سے کرامات ہونے

لگیں۔ بھولی بسری یادیں اس کا سرمایۂ حیات بن کر اسے نوسٹیلجیا کا نفسیاتی مریض بنا گئیں۔
خلافت راشدہ اور خلافتِ اُمیہ تو دُور کی بات ہے' خلافت عباسیہ کو بھی ختم ہوئے دوسو برس ہو چکے تھے۔ فتح قسطنطنیہ کے بعد عالم اسلام میں بڑی عظیم الشان سلطنتیں قائم ہوئیں' لیکن کسی ایک سلطنت نے بھی بیچاری مسلم نفسیات کا درد نہ جانا' خلافتِ عثمانیہ' ایرانی صفوی سلطنت' ہندوستان میں مغلیہ سلطنت۔ ایسا نہیں تھا کہ مسلمان سلاطین' بادشاہ اور شہنشاہ مغرب میں ترقیٔ علوم سے بے خبر تھے۔ یہ بھی ناممکن تھا کہ مسلمان بادشاہوں کو وینس اور جنیوا کے باشندوں کی ترقی علوم اور عروجِ دنیا کا علم نہ ہو' جس کی بدولت انہوں نے اسلحہ سازی میں نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ مسلمان سلاطین پرتگالیوں کی اس مہارت سے بھی ناواقف نہ تھے جو انہوں نے جہاز رانی اور جہاز سازی میں حاصل کی تھی' اور جس کی وجہ سے وہ دنیا کے تمام سمندروں پر حکمرانی کر رہے تھے' ان میں وہ سمندر بھی شامل تھے جو حج کے راستے میں پڑتے تھے۔

ہاں' ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ مسلمان بادشاہوں نے عالیشان مقبرے بنوائے' بڑے پختہ قلعے تعمیر کروائے' عظیم الشان مسجدیں بنوائیں' مسجدوں سے متصل مدرسے اور مکتب کھولے اور ان کے سارے اخراجات اپنی گرہ سے پورے کئے۔ مسلم نفسیات کو پوری پوری تلقین کی کہ نمازیں پڑھا کرو' روزے رکھا کرو' زکوٰۃ دیا کرو' حج کیا کرو' قرآن کے گھوٹے لگایا کرو' حدیثیں رٹا کرو' لیکن خبردار آکسفورڈ کی طرف نہ دیکھنا' کیمبرج یونیورسٹی پر نگاہ کی تو کفر والحاد کی ناپاک روشنی سے تم اندھے ہو جاؤ گے' پیرس یونیورسٹی کی طرف نہ دیکھو' جامعۃ الازہر میں جاؤ' جامعہ زیتون میں جاؤ۔ چنانچہ مسلم نفسیات کی پیچیدہ ڈوری میں ایک اور گرہ لگ گئی۔ تحقیق و تخلیق کے دروازے اس پر بند ہو گئے۔ معقولات کی کھڑکی سے آتی ہوئی روشنی کفر قرار پائی اور منقولات اور تقلید کی دہلیز پر حال کھیلتے رہنا مسلم نفسیات کا مقدر ٹھہرا۔ ساڑھے پانچ سو سال تک مسلسل حال پر قناعت کئے رہنا یہ مسلم نفسیات ہی کا حوصلہ ہے' مسلم نفسیات کس قدر سخت جان ہے!

مسلم نفسیات اگر مغرب کو اپنا حریف خیال کرتی ہے تو مغرب کا حال اس عرصے میں یہ رہا کہ وہ تحریک احیائے علوم' اس کے بعد اصلاح مذہب' اس کے بعد عظیم انقلاب' پھر انقلابِ فرانس' پھر انقلابِ صنعت' پھر انقلابِ روس' پھر پہلی جنگ عظیم' پھر خلافت عثمانیہ کے خاتمے پھر دوسری جنگ عظیم کے انقلابات سے گزرتا ہوا' پہلے برٹش ایمپائر کی صورت میں اور اب امریکی استعمار کی صورت میں' پنجۂ یہود بن کر مسلم معیشت' مسلم تہذیب اور مسلم وجود کی گردن

پر اپنے دانت گاڑے ہوئے ہے۔اس نے مسلم ملکوں کی پوری پوری آبادی اور ان کے پورے پورے وسائل و ذرائع پر قابض و متصرف رہ کر' اور انہیں بھاری شرح پر قرضے اور اقتصادی امداد دے دے کران کی روح اور نفسیات کو گروی رکھ لیا ہے۔

صدیوں سے موجود احساس کمتری پر مقروض کا سا احساسِ لاچارگی بھی مسلم نفسیات کی جڑوں میں بیٹھ گیا ہے۔ جب آدمی کسی بڑی بیماری میں مبتلا ہو کر ڈھے جاتا ہے تو اسے کئی طرح کی چھوٹی چھوٹی بیماریاں بھی چمٹ جاتی ہے۔ڈپریشن اور ٹینشن' اور جانے کیا کیا اَلا بلا۔حصولِ آزادی بیماریوں کو جھٹک دینے کا اچھا موقع تھا' لیکن مسلم ملکوں میں فوجی یا سول حکمرانوں نے مغرب کے گماشتوں کا کردار ادا کیا۔انہی کی طرح عوام کے حقوق غصب کئے' بدعنوانیوں اور بے انصافیوں کو پروان چڑھایا۔عوام' جنھوں نے آزادی کی تحریکوں میں قربانیاں دی تھیں' یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ ہمارے حکمرانوں سے انگریز یا فرنچ یا ڈچ ہی اچھے تھے کہ کم از کم ان کے گورنروں کے ہاں شرفاء کی بیٹیاں تو برآمد نہیں ہوتی تھیں۔اپنے گھر کے اندرونی مسائل سے مسلم نفسیات میں اجتماعی شیزوفرینا کے آثار پیدا ہو گئے۔مسلم معاشروں کو چپ لگ گئی اور قوتِ مزاحمت ٹھٹھر کر رہ گئی۔حکمران ٹولے ان کے ساتھ جو سلوک چاہیں' کریں' وہ خاموشی سے ایک دوسرے کا مُنہ تکتے رہتے ہیں۔

مسلم نفسیات کسی قدر زُود رنجیدہ بھی واقع ہوئی ہے۔تہذیبوں کے تصادم میں اس خوف سے کہ مقابل تہذیب کو ہماری خامیاں اور کمزوریاں معلوم نہ ہونے پائیں' مسلمان سچ کو چھپاتے اور جھوٹ کو نمایاں کرتے ہیں اور اس مقصد سے اپنی تاریخ کے حقائق کو مسخ کر لینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔فلاں بادشاہ پنج وقتہ نمازی تھا' اسے تو اچھالیں گے اور وہ اپنے باپ بھائیوں کا قاتل تھا' اس کی پردہ پوشی کریں گے۔اسی لئے مسلمان تلخ حقائق کا سامنا کرنے سے گھبرانے کے عادی ہو گئے ہیں' لیکن یہ عادت انہیں بہت مہنگی پڑ رہی ہے' کیونکہ ان کی نفسیات کی گہرائیوں میں جا کر گھر کر لیتی ہے اور مسلمانوں کی قوتِ عمل کو گھن کی طرح چاٹتی رہتی ہے۔اپنی ہی پیدا کردہ خامیوں اور غلطیوں کو دوسروں کی سازش قرار دینے کا عمل اسی پردہ پوشی کی عادت سے پیدا ہوتا ہے۔

ان تمام چھوٹی بڑی بیماریوں نے جمع ہو کر مسلم نفسیات کو' دوسری عمل پسند تہذیبوں کے مقابلے میں' ڈے ڈریمر (دن میں خواب دیکھنے والا) بنا دیا ہے۔مسلمان ہر وقت ایک خواب کی سی کیفیت میں مبتلا رہتا ہے۔مستقبل قریب میں خلافت راشدہ کے نمونے پر اسلامی نظام

کے قیام کی تمنا' نا آسودہ آرزو۔ خلافت راشدہ سے کم کا کوئی نظام مسلمان کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا۔ اتنی بڑی آسمانی نوعیت کا خواب ہر وقت' ہر لمحے مسلم نفسیات کے اندر پیدا ہوتا رہتا ہے' ٹوٹتا رہتا ہے' پیدا ہوتا رہتا ہے' ٹوٹتا رہتا ہے' اور یوں مسلم وجود اور مسلم ذہانت شق ہو کر رہ گئی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے' کیا مسلم نفسیات دوسری تہذیبوں سے کشمکش کرتے وقت ہمیشہ کے لئے کچلی جائے گی؟ کیا مریض کے بحال ہونے کی کوئی امید ہے؟ ہاں' امید ہی نہیں' پورا یقین ہے۔ مسلم نفسیات کے اجتماعی لاشعور کی آخری گہرائیوں کے رگ ریشے میں وہ ایک چیز جو پیوست ہے اور جس نے اسے دوسری تہذیبوں سے منفرد و ممتاز اور زیادہ طاقتور بنا رکھا ہے' وہ ہے اس کا عقیدہ۔ مسلمانوں کے عقیدے کے حوالے سے مجھے ابن رشد کا ایک قول یاد آ رہا ہے۔ اُس نے کہا تھا:

> ''مسلمانوں کا علم الحقائق حواس' مشاہدات اور تجربات کی بنیاد پر نہیں' عقیدے کی بنیاد پر استوار ہے۔ ایک حقیقت وہ ہے جس کا علم عقل کے ذریعے فلسفیوں اور سائنس دانوں کو حاصل ہوتا ہے اور دوسری حقیقت وہ ہے جس کا علم وحی کے ذریعے انبیاءؑ کو اور عقیدے کے ذریعے عام انسانوں کو حاصل ہے''۔

ابن رشد نے کس تدبر سے وحیٔ الٰہی کو عقیدے کی اساس پر عام انسانوں تک پہنچا دیا ہے۔ یہ عقیدہ کہ لَا رَیْبَ فِیْہِ' یہ کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں' یہ کہ محمد ﷺ آخری رسول ہیں' یہ کہ بالآخر انسان کے اعمال کا حساب کتاب ضرور ہوگا۔ توحید' رسالت اور آخرت پر مبنی یہ عقیدہ' یہ مردِ بیمار کو بحال کرنے کا ٹانک ہے' اک نسخۂ اکسیر ہے' جس دن بھی اسے استعمال کرے گا وہ اٹھ کھڑا ہوگا۔

اپنے اس عقیدے کی بنیاد پر پہلے بھی مسلمان بار بار نشاۃِ ثانیہ یا احیائے اسلام کی خاطر اٹھے' بڑے بڑے مجددین اور مصلحین ان کی رہنمائی کے لئے دستیاب رہے' لیکن کبھی کوئی تحریک اس لئے کامیاب نہ ہوسکی کہ انہوں نے اپنے عقیدے کی طاقت کو علم کی طاقت سے آمیز نہیں کیا۔

مستقبل میں احیائے اسلام کی کوئی تحریک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک عقیدے کو علم کی طاقت سے ہم آہنگ نہ کیا جائے۔ عقیدہ مقصد ہے اور علم ذریعہ۔ عقیدہ ایمان ہے' علم عمل ہے' ایک وسیلہ ہے' ایک ہتھیار ہے۔ مغرب میں جتنے بھی غیر مسلم اسلام قبول کر رہے ہیں' وہ

اسلام کے عقیدے کی بنا پر کر رہے ہیں' مسلمانوں کے علم کی بنا پر نہیں۔ اگر نشاۃِ ثانیہ لانا مقصودِ مؤمن ہے تو اس کے لئے پہلے مغرب کی طرح مسلم دنیا کو تحریک احیائے علوم کی کٹھناؤں سے گزرنا پڑے گا' جو برس دو برس کی نہیں' دو چار صدیوں کی کہانی ہوگی' لیکن خبردار ہوشیار' مغرب کی تحریک احیائے علوم' جو اُسے معراجِ کمال تک لے آئی ہے' آج اس کے زوال کی نشاندہی بھی کر رہی ہے۔ وہ غلط مذہب کے خلاف شدید ردعمل کے طور پر پیدا ہوئی تھی۔ اس لئے اس نے وحیٔ الٰہی کو نظر انداز کیا اور عقل محض کو اپنے سارے علوم کی بنیاد قرار دیا۔ چنانچہ آج کے مغربی دانشور برملا اعتراف کر رہے ہیں کہ مغربی تہذیب اخلاقی اقدار سے ناآشنا ہو چکی ہے۔ وہ مادہ پرستی' خود پرستی اور بے ضمیری کی نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو کر کسی مسیحا کی تلاش میں ہے جو ملتا ہے تو اسلام کے عقائد میں۔

آج مسلم نفسیات کو' مسلم اُمہ کو' سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ ہے احیائے علوم کی تحریک کا برپا ہونا' جو وحیٔ الٰہی اور عقل کی آمیزش سے منظم کی جائے۔ اس کے لئے ہمیں عقل کے بارے میں اپنے رویوں میں تبدیلی پیدا کرنی ہوگی جو صدیوں سے مسلم نفسیات کی جڑوں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ امام غزالی جیسا عظیم مفکر جب تصوف کے عشق میں مبتلا ہوا تو ریاضی اور سائنس کا دشمن ہو گیا۔ اسی طرح بابائے تاریخ اور مشہور فاضل عمرانیات ابن خلدون اپنی تاریخ کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> ''ہم نے سنا ہے کہ فرنگیوں کے ملک' بحیرۂ روم کے شمالی ساحلی علاقوں میں علوم طبیعی کا بڑا چرچا ہے۔ اس کی تعلیم مختلف درجوں میں بتکرار دی جاتی ہے اور ان علوم کی تفسیر و تشریح مفصل کی جاتی ہے۔ ان علوم کے جاننے والے بہت زیادہ ہیں اور طلبہ کی تعداد بھی بے شمار ہے۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ علوم کیا ہیں اور کیسے ہیں' لیکن ہم اتنا جانتے ہیں کہ طبیعیات کے مسائل دین اسلام اور ہمارے دینی معاملات سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے اور نہ ہی ان کی کوئی اہمیت ہے۔ اس لئے ان علوم طبیعی سے ہمارا دُور ہی رہنا بہتر ہے۔''

لیکن افسوس کہ آج کے سنگین حالات کا چیلنج قبول کرنے کے لئے امام غزالی اور ابن خلدون کے بتائے ہوئے بعض راستوں پر نہیں چلا جا سکتا۔ ہمیں اپنی راہیں اپنے عقائد کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے پیش آمدہ حالات کے تقاضوں کے مطابق اپنی عقل و دانائی سے خود تراشنا ہوں گی۔ مردِ بیمار کو جلد بستر مرگ سے اٹھانے کے لئے عقیدے کا نسخۂ اکسیر پلانا ہوگا۔

علوم طبیعی کی بیساکھیاں اُس کے دونوں ہاتھوں میں تھما کر تجدید و احیائے اسلام کی منزل کی طرف جانے والا روشن راستہ دکھلا کر' تہذیبوں کے میدانِ کارزار میں فکری و علمی اجتہاد کی قوت سے جہادی جذبے سے کام لینا ہوگا۔ ۲۰۱۵ء تک سب سے بڑی اسلامی مملکت کا شیرازہ بکھرنے کی پیشین گوئی کرنے والے امریکی تھنک ٹینک کا جواب دینے کے لئے ایک اسلامی و پاکستانی ''تھنک ٹینک'' قائم کرنا ہوگا۔

یہ تھنک ٹینک کون قائم کرے؟ میں کہتا ہوں' ہر وہ انجمن یا ادارہ یا مجلس یا اکادمی جو آئے دن تقریبات اور چائے پارٹیوں کے ہنگامے برپا کرتی رہتی ہے۔ مثلاً آپ کی یہ ''انجمن ترقی مسلم نفسیات'' آپ چاہیں' تو آپ کا یہ اجلاس ختم ہوتے ہی ''انجمن احیائے علوم'' کی صورت میں ڈھل سکتی ہے۔ جارج بش کے سینے سے نکلی ہوئی زہرناک گولی ''کروسیڈ'' مسلم نفسیات کے سینے میں گڑ گئی ہے۔ اسے نکالنے کی ذمہ داری مسلم ماہرین نفسیات ہی پر عائد ہوتی ہے۔ ہفتے میں ایک شام مسلم اُمہ کو پیش آمدہ مسائل پر گفتگو کیجئے' بحث مباحثہ کیجئے' مضامین پڑھئے' تحقیقی مقالات لکھئے اور لکھوائیے' حریفوں کو مسکت اور مدلل جواب دیجئے۔ آج سے سو سال پہلے جب ہم افرنگ کی غلامی' صرف غلامی میں آئے تھے تو حالی بلبلا اٹھا تھا:

اے خاصۂ خاصانِ رُسل' وقت دعا ہے
امت پہ تری وقت' عجب آن پڑا ہے!

لیکن آج رسول ﷺ کی امت پر جو وقت آن پڑا ہے' وہ حالی کے وقتوں سے کہیں زیادہ سخت' شدید اور بھاری ہے' اور یقیناً یہ وقتِ دعا نہیں' وقتِ عمل ہے۔

(بشکریہ پیغام آشنا' اسلام آباد)

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات و احادیث درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

خدمتِ خلق اور اسلامی انقلاب کا باہمی تعلق

تحریر: انجینئر مختار حسین فاروقی

انسان بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی شاہکار تخلیق ہے اور عالمِ خلق اور عالمِ امر کی خصوصیات کا حامل ہے۔ تخلیق انسانی میں اللہ تعالیٰ نے بہت سے جذبات' میلانات اور رجحانات ودیعت فرما دیئے ہیں۔ ساتھ ہی دوسری طرف انسان ایک معاشرتی حیوان (Social Animal) یعنی مل جل کر رہنے والی مخلوق ہے' لہٰذا اچھے اور بُرے ماحول کے اثرات بھی انسان پر مترتب ہوتے رہتے ہیں۔ نیکی اور بدی کے جذبات الہامی طور پر فطرت کا حصہ ہیں اور یوں یہ دنیا نیک اور بد خصلت لوگوں کا مجموعہ ہے اور رہے گی۔

محبت' نفرت' غصہ وغیرہ کی طرح خدمت خلق اور نیکی کرنے کا جذبہ بھی یقیناً انسان کی فطرت کا حصہ ہے۔ محبت و غصہ کے معاملے میں جیسے بہت سے لوگ انتہا پسند اور اعتدال پسند واقع ہوتے ہیں بعینہٖ خدمت خلق کے مقابلے میں بھی انسان ایک جذباتی اور انتہا پسند طرزِ عمل کا مظاہرہ کرتا ہے۔

انسان میں نیکی بدی کی تمیز ایک بنیادی وصف ہے اور انسان نیکی یا بدی میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے اور دوسرے کو ارادتاً ترک کر دینے کا اختیار رکھتا ہے۔ خدمت خلق ایک نیکی اور مثبت جذبہ ہے جبکہ سنگدلی' مردم بیزاری' خودغرضی وغیرہ خدمت خلق کی ضد ہیں اور منفی جذبات میں سے ہیں۔ نتیجتاً کہا جا سکتا ہے کہ اچھا انسان اور خدمت خلق لازم و ملزوم ہیں جبکہ بدمزاج انسان یا بُرے انسان کو لازماً خودغرض' سنگدل اور مردم بیزار وغیرہ سمجھا جاتا ہے۔

خدمت خلق کا جذبہ عین فطرتِ انسانی ہے اور ایک معقول' بھلا مانس اور اچھا انسان لازماً اس جذبے سے سرشار ہوگا' بلکہ دوسروں کو بھی اس کی توجہ دلائے گا۔ قرآن مجید میں ایک اچھے انسان کے اوصاف میں بنی نوع انسان کے لئے نفع رسانی اور خدمت کا وصف بہت ہی بنیادی وصف شمار کیا گیا ہے۔ چنانچہ دنیا و آخرت میں کامیاب لوگوں کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ﴾ (الدھر)
''اور وہ (مال کی) محبت کے باوجود مسکینوں' یتیموں اور (بلاوجہ) قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔''

مزید برآں ان کی اچھائی کا ایک خاص پہلو یہ بھی ہے کہ وہ عام دنیادار سوشل ورکرز یا Political Welfare کے پراجیکٹس پر مامور افراد کے برعکس اس ''خدمت'' کا کوئی معاوضہ بھی نہیں مانگتے' بلکہ شکریہ تک کا لفظ سننے کی بھی دل میں آرزو نہیں رکھتے چنانچہ اگلی آیت میں وارد ہوا ہے کہ وہ خدمت خلق کے سلسلے میں یہ جذبات رکھتے ہیں کہ:

﴿اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا﴾ (الدھر)
''ہم تو آپ کو صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے کھلاتے ہیں' ہم آپ سے (کسی قسم کا) بدل یا سپاس کے جذبات (نیاز مندی) کا اظہار بھی نہیں چاہتے۔''

اسلامی تعلیمات کے مطابق احسان' ایمان اور اسلام کے درجات سے نیچے ایک انسان ہونے کا درجہ ہے اور ایک حقیقی ابن آدم کو چاہے ''انسان'' کہہ کر پکاریں چاہے ''خادم خلق'' بات ایک ہی ہے۔ یوں بات یہاں تک پہنچتی ہے کہ خدمت خلق کے جذبات سے عاری آدمی انسان نظر تو آئے گا مگر حقیقتاً انسان کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ اور یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ بہت سے انسان جو اسلام کے درجے سے اٹھ کر ایمان اور احسان کے اعلیٰ درجات کے حصول کے لئے مجاہدات میں مصروف ہیں' اگر خدمت خلق کے جذبے سے عاری اور تہی دست ہیں تو (بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ) وہ محسن اور مؤمن و مسلم تو درکنار انسان کہلانے کے مستحق بھی نہیں ہیں۔

خدمت خلق کے مختلف گوشے

خدمت خلق کا مفہوم بہت وسیع ہے اور انسانی زندگی کے کثیر گوشوں کی طرح اس کے بھی کئی گوشے ہیں۔ چنانچہ اس کو سمجھنے کے لئے اسے دو طرح سے تقسیم کیا جا سکتا ہے' ایک اُفقی تقسیم اور دوسری عمودی تقسیم۔

اُفقی تقسیم کی مثال مختلف تہوں کی مثال ہے جو اوپر نیچے ہوں۔ جیسے عام فہم سطح پر روٹیاں اوپر نیچے رکھی ہوں' جبکہ عمودی تقسیم کی مثال ایسے ہے جیسے کیک کو کاٹا جاتا ہے اور اس کی قاشیں مختلف انداز میں الگ کر لی جاتی ہیں۔

اُفقی تقسیم کے اعتبار سے خدمت خلق کے گوشے تین ہیں:

i) ضرورت مند اور محتاج انسانوں کی مالی' اخلاقی اور تعاون کے انداز میں مدد' تا کہ ان کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوسکیں۔

ii) انسانوں کے روحانی اور اُخروی مفاد کے لئے کوشش اور محنت' یعنی دوزخ سے رہائی اور جنت کی ابدی زندگی کے حصول کے لئے تگ ودو کرنا۔

iii) اعلیٰ ترین سطح پر خدمت خلق یہ ہے کہ چونکہ آج کل ملکی نظام عام طور پر جبر واستحصال کی مکروہ صورتیں ہیں' جس میں انسان کی آزادی اور انفرادیت دب کر اور سکڑ کر نہ ہونے کے برابر ہوگئی ہے اور انسان کی حیثیت ڈھور ڈنگروں سے زیادہ نہیں رہی اور وہ معاشی حیوان بن کر رہ گئے ہیں' لہٰذا اس نظام کو بدلنا اور انسانوں کو ظلم وستم سے نکال کر آزادی اور اللہ کی بندگی کی خوشگوار وادی میں پہنچا دینا۔ یقیناً یہ سب سے اعلیٰ خدمتِ خلق ہے۔

عمودی تقسیم کے لحاظ سے خدمت خلق کے دو حصے ہیں:

i) انفرادی اور نجی سطح پر افرادِ بنی نوع انسان کی خدمت کرنا۔

ii) اجتماعی سطح پر اور mass scale پر کثیر تعداد میں عوام الناس کی مجموعی بہتری کے لئے منصوبے بنانا اور چلانا یا ان کی فلاح وبہبود کے لئے سرتوڑ کوششیں کرنا۔

انقلابی کارکنوں کی جدوجہد کا ہدف اور اسلامی انقلاب کا ماحصل

اگرچہ اسلامی انقلاب کے لفظ سے آج کل ہر شخص اور طبقہ اپنے ذہن کے مطابق مفہوم اخذ کرتا ہے' تاہم وہ انقلاب جو قرآن مجید کی تعلیمات اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں صحابہ کرام ؓ کی قربانیوں کا ثمر تھا وہ انفرادی واجتماعی حالات کی ایسی تبدیلی تھی جس میں اجتماعی سطح پر ہر طرح کے شر کی سرکوبی اور منکرات کا خاتمہ تھا' جس سے انسان حیوان کی سطح سے ابھر کر انسان کی سطح پر آیا اور غریبوں اور پسے ہوئے طبقات کو بھی سکون اور سکھ کا سانس لینے کا موقع ملا۔ چنانچہ خلافت راشدہ کے مبارک دور میں انصاف' مساوات' بنیادی انسانی ضروریات کی فراہمی' آزادی' اخوت غرض اعلیٰ انسانی قدر عام میسر تھی اور منفی اقدار از قسم چوری' ڈاکہ' بے حیائی' عریانی' فحاشی' جبر' استحصال' ناانصافی' ظلم وجور اور رنگ ونسل وزبان کی بنیاد پر عزوشرف کی غلط بنیادیں منہدم کر دی گئی تھیں۔ بالفاظ دیگر خلافتِ راشدہ کا قیام یا محمد ﷺ کا لایا ہوا انقلاب ایسا ماحول تھا کہ جس میں اجتماعی سطح پر ہر طرح کی فلاح وبہبود کا اہتمام تھا اور اسی کو آج کی اصطلاح میں Ideal Democratic Welfare Islamic State کہا جاسکتا ہے۔

الغرض اسلامی انقلاب خدمت خلق کے اعلیٰ مقاصد کے حصول ہی کا نام ہے اور اسلامی انقلاب کے لئے صحابہ کرام ﷺ کی اعلیٰ شخصیات ہوں یا آج کے اسلامی انقلاب کے ادنیٰ کارکن جو صحابہ کرامؓ کے نقش قدم پر چل رہے ہوں' وہی حقیقی انقلاب کے سپاہی ہیں یا بالفاظ دیگر وہی صحیح خدمت خلق کا حق ادا کرنے والے اور خادم خلق کہلانے کے حقیقی مستحق ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اسلامی انقلاب کا ماحصل وہ اجتماعی عدل کا نظام ہے جس میں جبر و استحصال سے پاک معاشرہ وجود میں آ جائے۔ جیسے فرمایا تھا ایک صحابی رسول ﷺ نے ایرانی بادشاہ کے دربار میں:

اِنَّا قَدْ اُرْسِلْنَا لِنُخْرِجَ النَّاسَ مِنْ ظُلُمَاتِ الْجَهَالَةِ اِلٰى نُوْرِ الْاِسْلَامِ وَمِنْ جَوْرِ الْمُلُوْكِ اِلٰى عَدْلِ الْاِسْلَامِ

''بے شک ہم بھیجے گئے ہیں (یعنی ایک مشن پر ہیں) کہ انسانیت کو جہالت کے اندھیروں سے نور اسلام کی طرف اور بادشاہوں کی چیرہ دستیوں (شاہ خرچیوں' بدمستیوں اور مطلق العنانیوں) سے نکال کر عدلِ اسلام کی طرف push کریں۔''

یہ عدل اجتماعی ہی خدمت خلق کی افقی تقسیم میں سب سے اعلیٰ و ارفع اور نمایاں ترین حصہ ہے جس سے خلق خدا بلا تقسیم بندہ و آقا' رنگ و نسل و زبان اور پیشہ و قابلیت مستفیض ہوتی ہے اور صدیوں ہوتی رہتی ہے' اور ایسی خدمت بجالانے والا یا اس مشن پر کمر کس لینے والا ہی انقلاب اسلامی کا رفیق و کامریڈ ہے اور یہی سب سے بڑا خادم خلق بھی۔

انفرادی اور اجتماعی خدمت خلق کا باہمی تعلق

تنظیم اسلامی کے تمام ساتھی یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ انقلاب نام ہی اس بات کا ہے کہ انسانی زندگی کے اجتماعی گوشے یکسر بدل جائیں۔ تاریخ عالم کے دیگر انقلابات سیاسی اور اقتصادی ہونے کے ساتھ ساتھ حد درجہ خونیں انقلاب تھے۔ اگر چہ اُن میں خدمت خلق کا جذبہ اجتماعی سطح پر کارفرما تھا تاہم ایک اسلامی انقلاب میں زندگی کے تمام گوشے بدل جاتے ہیں اور مخلوق کا تعلق اپنے خالق و مالک حقیقی سے جڑ جاتا ہے' لہٰذا اعلیٰ انسانی اقدار یعنی مساوات' اخوت' انسانی ہمدردی وغیرہ کا عنصر غالب اور نمایاں رہتا ہے اور یوں اسلامی انقلاب کے لئے محنت کرنے والوں کی قربانیاں رنگ لاتی ہیں اور اجتماعی سطح پر عدل و انصاف' آزادی' حقوق' روٹی کپڑا مکان' تعلیم اور علاج معالجہ جیسی انسانی ضرورتیں چھینا جھپٹی کے انداز میں نہیں بلکہ انسانی عزت و وقار اور شرافت کے ساتھ بالادستوں کے پہلو بہ

پہلو کمزوروں اور ناتوانوں کو بھی میسر آنے لگتی ہیں۔

اسلامی انقلاب کے ایک کارکن کے لئے انقلاب کے تکمیل پذیر ہونے اور عملاً واقع ہونے پر تو جو خوشی' سرور اور اطمینان حاصل ہوتا ہے وہ تو فطری ہے اور فطرتِ بشری کا لازمی تقاضا ہے' تاہم اس اعلیٰ مقصد کے حصول سے قبل بھی اس راہ کے مسافر کی حیثیت سے چلتے ہوئے' مشکلات و مصائب سہتے ہوئے' پیٹ پر پتھر باندھے ہوئے بھی جو وقت گزرتا ہے راہِ حق کے اِن مسافروں اور خدمتِ خلق کے اِن وفا کیشوں کے لئے اس کا سرور و اطمینان بھی کسی بڑی سے بڑی دنیاوی کامیابی سے زیادہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کے لبوں پر یہ ترانے جاری ہوتے ہیں جو ۵ھ میں خندق کھودتے ہوئے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زبانوں پر جاری تھے۔

نَحْنُ الَّذِیْنَ بَایَعُوْا مُحَمَّدًا
عَلَی الْجِهَادِ مَا بَقِیْنَا اَبَدًا

اور جناب رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک پر یہ الفاظ رواں تھے۔

اَللّٰهُمَّ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشُ الْاٰخِرَةِ
فَاغْفِرْ لِلْاَنْصَارِ وَالْمُهَاجِرَةِ

اسی جدوجہد میں جب وقت کٹتا ہے اور عرصہ گزرتا ہے تو ـــــ جناب نبی اکرم ﷺ اور ان کے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے تو اس کا امکان بھی نہیں تھا مگر آج یہ ہوسکتا ہے اور عملاً ہے کہ ـــــ اسلامی انقلاب کے کارکنان اس اجتماعی جدوجہد میں جان و مال کھپا کر بزعم خویش سمجھتے ہیں کہ ہم نے خدمتِ خلق کا حق ادا کر دیا ہے اور شیطان کے بہکاوے میں آ کر انفرادی سطح پر خدمتِ خلق کے جذبے کو سامنے نہیں آنے دیتے۔ اس مصروف دَور میں یہ کہا جاتا ہے کہ ہمارے پاس ذاتی سطح پر غریبوں مسکینوں کی مدد' ان کی تلاش' ان کی دلجوئی اور ان کے حقوق ادا کرنے کا وقت نہیں ہے' اس لئے کہ ہم سارا وقت اجتماعی خدمتِ خلق کے لئے وقف کئے ہوئے ہیں۔

میرے ساتھیو! یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ خدمتِ خلق کے لئے انقلاب کی جدوجہد ہو یا سیاسی جماعتوں کے ذاتی پروگرام اور ویلفیئر کے ادارے' حتیٰ کہ کوئی کسی خیراتی ادارے میں ہمہ وقت کارکن ہی کیوں نہ ہو ـــــ اس کی یہ جدوجہد اس کو آخرت میں مؤاخذے سے نہیں بچا سکتی اگر وہ ذاتی سطح پر انسانی ہمدردی' رأفت و رحمت' غریبوں کی

خبر گیری‘ بیواؤں اور مسکینوں کی دادرسی جیسے جذبات سے عاری ہے۔

اجتماعی خدمت خلق کی کوشش اور شے ہے اور ذاتی سطح پر غریبوں کے دکھ درد بانٹنا بالکل دوسری بات ہے۔ چنانچہ اس غلط فہمی سے بچئے اور اپنے آپ کو دھوکہ نہ دیجئے اور نہ دھوکہ میں آیئے یہ خدمت خلق کا وہ پہلو ہے جو اسلامی انقلاب کی جدوجہد کے دوران بھی بہت زیادہ اہم اور ضروری ہے اور اسلامی انقلاب کے بعد بھی ذاتی سطح پر اس کی اہمیت وضرورت یکسر ختم نہیں ہوگی۔ لہٰذا انقلاب اسلامی کے لئے محنت کرنے والے ایک رفیق اور کامریڈ کی حیثیت سے ذاتی سطح پر خدمت خلق کے کام کرنا‘ غریبوں کی مدد‘ بیماروں‘ معذوروں‘ بوڑھوں‘ بیواؤں اور یتیموں کی دادرسی اور خبر گیری جیسے کام از حد ضروری بلکہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ اہمیت کے حامل ہیں اور ہمیں ایسے کاموں میں دوسروں کو پیچھے چھوڑنے کا جذبہ پیدا کرنے کا تہیہ کرنا چاہئے کہ ہم اس کے زیادہ اہل اور ضرورت مند ہیں۔

چنانچہ ایک مثالی اسلامی انقلابی رفیق کی خصوصیات میں انفرادی سطح پر خدمت خلق کے کام اور دل میں انسانی ہمدردی اور رأفت ورحمت کا جذبہ ہمیشہ موجزن رہنا چاہئے۔ ہمارے لئے نبی اکرم ﷺ کی مثالیں روشنی کا منارہ ہیں۔ حضرت ابوبکر‘ حضرت عمر اور دیگر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین ذاتی اور امارت کی مصروفیات کے باوصف اس درجہ کی خدمت کا بھی کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ بننے کے بعد بھی ایک ضرورت مند خاتون کے گھر کا کام کاج کرآتے تھے۔ یہ بڑا قیمتی انسانی جذبہ ہے جس کی آج سخت ضرورت ہے۔

اُسوۂ حسنہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام

اس معاملے میں جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے جو اُسوہ چھوڑا ہے وہ بڑی تابناک شان رکھتا ہے جسے مسدس حالی میں ان الفاظ میں سمویا گیا ہے۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

یہ شان صحابہ کرام ﷺ میں بھی موجود تھی' مگر آج اسلامی انقلاب کے متوالوں اور شیدائیوں میں ناپید ہے۔ یقیناً اسوۂ رسول ﷺ یہی ہے۔ آج کا غریب بیچارہ ہر طرف سے دھکے کھاتا ہوا' دو وقت کی روٹی سے محروم' وسائل سے تہی دست اگر مصیبت میں اللہ کے رسول ﷺ کو ہی یاد کرتا ہے تو اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں ہے کہ دنیا کے لٹیرے حاکم' سرمایہ دار' جاگیردار' تاجر اور باحیثیت سرکاری اہلکار تو ہیں ہی ایسے کہ کسی بے نوا کو جینے کا حق دینے کو تیار نہیں ہیں۔ مذہبی رہنما اور پے در پے حج اور عمرے کرنے والے قدامت پرست مذہبی افراد بھی اس پہلو سے خالی ہاتھ ہیں —— اور باعث شرم ہوگا اگر اجتماعی سطح پر خدمت خلق کے دعوے دار اور اسلامی انقلاب کے رفیق اور کامریڈ یعنی مَیں اور آپ بھی اس معاملے میں ذاتی سطح پر اور باطنی کیفیات کے حوالے سے اس سے تہی دست یا خالی دامن ہوں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ خدمت خلق کا جذبہ بہت ہی مبارک جذبہ ہے اور بنیادی انسانی وصف ہے۔ یہ بنی نوع انسان کی ہمدردی کے جذبے سے دنیاوی اور اُخروی فلاح کی بھرپور کوشش کا نام ہے اور اجتماعیت کو بدل کر خادم خلق بنا دینا بھی اسی جذبے میں درجۂ احسان ہے۔ مزید برآں اجتماعی سطح پر اسی جذبے کا مظہر اسلامی انقلاب کا واقع ہونا اور اس کا کامیابی سے چلانا ہے' جبکہ ابتدائی درجے میں اسلامی انقلاب لانے کی ادنیٰ کوشش بھی اجتماعی خدمت خلق کا حصہ ہے۔ لیکن اسلامی انقلاب یا اجتماعی سطح پر نظامِ خلافت کا کام کرنے کے باوصف ہم کارکنان کو ذاتی سطح پر بھی خدمت خلق کا جذبہ رکھنا لازم ہے۔ اجتماعی سطح پر کوششیں اور بات ہے اور انفرادی سطح پر ہمدردی' غمخواری' دلجوئی اور غرباء و مساکین کے ساتھ عاجزی و انکساری کا رویہ ایک دوسرا پہلو ہے جو اللہ کی نگاہ میں معزز و کامران ہونے کی شرط لازم ہے۔ جیسے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس کی ایذا رسانیوں سے اس کا پڑوسی مطمئن نہیں وہ خدا کی قسم مؤمن نہیں'' یا فرمایا ''جو شخص دل کی نرمی سے محروم کر دیا گیا وہ کل خیر سے محروم کر دیا گیا''۔ اعاذنا اللّٰہ من ذٰلك

اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو حقیقی خادمِ خلق بنا دے۔ آمین!

(یہ مضمون تنظیم اسلامی کے سالانہ اجتماع منعقدہ اکتوبر ۲۰۰۴ء میں پیش کیا گیا)

مسلمان کا طرزِ حیات (۴۰)

علامہ ابوبکر جابر الجزائری کی شہرۂ آفاق کتاب

"مِنھاجُ المسلم" کا اردو ترجمہ

مترجم : مولانا عطاء اللہ ساجد

کتاب الآداب

چھٹا باب

موزوں اور پٹی پر مسح

(۱) موزوں اور پٹی پر مسح کی مشروعیت:

موزوں اور جرابوں وغیرہ کا حکم قرآنِ مجید اور حدیث شریف سے ثابت ہے۔ قرآن مجید میں وضو کی آیت میں "وَاَرْجُلَکُمْ" کے لفظ میں ایک قراءت 'ل' کی زیر سے "وَاَرْجُلِکُمْ" بھی ہے۔ اس صورت میں اس کا عطف بِرُءُوْسِکُمْ پر ہے' اور اس سے مسح کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ حدیث سے دلیل آنحضرت ﷺ کا یہ فرمان ہے:

((اِذَا تَوَضَّأَ اَحَدُکُمْ فَلَبِسَ خُفَّیْهِ فَلْیَمْسَحْ عَلَیْهِمَا وَلْیُصَلِّ ' وَلَا یَخْلَعْهُمَا اِنْ شَاءَ اِلاَّ مِنْ جَنَابَةٍ))(۱)

"تم میں سے کوئی شخص جب وضو کر کے موزے پہنے' تو ان پر مسح کر کے نماز پڑھ لیا کرے۔ اور حالتِ جنابت کے علاوہ اگر چاہے تو موزے نہ اُتارے۔"

اس حدیث میں وقت کا تعین نہیں۔ یہ تعین دوسری حدیث میں ہے جو آئندہ ذکر ہوگی۔

پٹی پر مسح کی دلیل اس شخص کا واقعہ ہے جس کے سر میں زخم آ گیا تھا۔ غسل کرتے ہوئے اس نے سر دھویا تو اس کی وفات ہوگئی۔ جناب رسول اللہ ﷺ کو جب یہ بات معلوم ہوئی' تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

(۱) سنن دارقطنی' کتاب الطهارة' باب ما فی المسح علی الخفین من غیر توقیت۔

((اِنَّمَا كَانَ يَكْفِيْهِ اَنْ يَّتَيَمَّمَ وَيُعَصِّبَ عَلٰى جُرْحِهٖ خِرْقَةً ثُمَّ يَمْسَحَ عَلَيْهَا وَيَغْسِلَ سَائِرَ جَسَدِهٖ))(۱)

''اس کے لئے کافی تھا کہ وہ تیمم کرتا۔ اپنے زخم پر پٹی باندھ لیتا' پھر اس پر مسح کرتا اور باقی جسم دھو لیتا۔''

(۲) مسح کی شروط:

موزوں وغیرہ پر مسح کے جواز کی شرطیں مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) موزے یا جرابیں پہنتے وقت انسان باوضو ہو۔ جناب رسول اللہ ﷺ کے وضو کرتے وقت حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے چاہا کہ آنحضرت ﷺ کے پاؤں سے موزے اتاریں تاکہ آنحضرت ﷺ پاؤں دھو سکیں۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا: ''رہنے دو' میں نے انہیں پاکیزگی کی حالت میں پہنا ہے''۔ (۲)

(۲) پاؤں کا جتنا حصہ دھونا فرض ہے' وہ سب موزے یا جراب میں چھپا ہوا ہو۔

(۳) جرابیں موٹی ہوں' جن کے نیچے سے جلد نظر نہ آئے۔

(۴) مقیم ایک دن رات سے زیادہ اور مسافر تین دن رات سے زیادہ مسح نہیں کر سکتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: ''رسول اللہ ﷺ نے مسافر کے لئے تین دن رات اور مقیم کے لئے ایک دن رات کی مدت مقرر کی ہے۔''(۳)

(۵) مسح کے بعد انہیں نہ اتارے۔ اگر اتارے گا تو پاؤں دھونا ضروری ہو گا' ورنہ وضو کالعدم ہو جائے گا۔

(۶) پٹی پر مسح کے لئے یہ شرط نہیں کہ وضو کر کے پٹی باندھی ہو۔ نہ اس کے جواز کی کوئی مدت معین ہے۔ اس کی شرط یہ ہے کہ وہ صرف زخم کی جگہ پر ہو۔ اس سے زائد صرف اتنی جگہ چھپائے' جس کی باندھنے کے لئے ضرورت ہے۔ اور اسے اتارا نہ جائے جب تک زخم صحیح نہ ہو گیا ہو۔ اگر پٹی اتر کر گر جائے یا زخم صحیح ہو جائے' تو مسح ختم ہو جائے گا اور جسم کے اس حصہ کو دھونا ضروری ہو گا۔

---

(۱) ابو داؤد' کتاب الطهارة' باب فی المجروح يتيمم۔

(۲) صحيح البخاری' کتاب الوضوء' باب اذا دخل رجليه وهما طاهرتان۔ وصحيح مسلم' کتاب الطهارة' باب المسح على الخفين۔

(۳) صحيح مسلم' کتاب الطهارة' باب التوقيت فی المسح على الخفين۔

نوٹ:

(۱) سردی' سفر یا کسی اور ضرورت کی بناء پر پگڑی پر مسح کرنا جائز ہے۔ حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے سفر کے دوران وضو کیا تو آپؐ نے سر کے اگلے حصہ پر اور پگڑی پر مسح کیا۔(۱) لیکن پگڑی پر مسح کرتے ہوئے ضروری ہے کہ سر کے کچھ اگلے حصہ پر بھی مسح کیا جائے جس طرح حدیث میں ہے۔

(۲) موزوں پر' پٹی پر اور سر ڈھانپنے والی کسی بھی چیز —— پگڑی وغیرہ —— پر مسح کرنے میں مرد اور عورت کا ایک ہی حکم ہے۔ جو کام مرد کے لئے جائز ہے' عورت کے لئے بھی جائز ہے۔

(۳) مسح کا طریقہ:

موزوں پر مسح کا طریقہ یہ ہے کہ ہاتھوں کو گیلا کرے۔ پھر بایاں ہاتھ موزے کی ایڑی کے نیچے رکھے اور دایاں ہاتھ پاؤں کی انگلیوں کے سروں پر رکھے۔ پھر بائیں ہاتھ کو پنڈلی کی طرف اور دائیں ہاتھ کو انگلیوں کی طرف لے جائے۔ اگر موزے کے نیچے مسح نہ کرے' صرف اوپر ہی کر لے تو کافی ہے۔ حضرت علی ؓ نے فرمایا: ''اگر دین کا دارومدار رائے پر ہوتا' تو موزے کے اوپر مسح کرنے کی نسبت نیچے مسح کرنا زیادہ مناسب ہوتا''۔(۲)

پٹی پر مسح کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہاتھ گیلا کر کے پوری پٹی پر ایک ہی بار پھیر لے۔

کتاب الآداب

ساتواں باب

حیض اور نفاس کے احکام

(۱) حیض اور نفاس کی تعریف

(۱) حیض:

حیض وہ خون ہے جو عورت کے رحم سے مقررہ ایام میں عادت کے مطابق آتا ہے۔

(۱) صحیح مسلم' کتاب الطهارة' باب المسح على الناصية والعمامة۔

(۲) سنن ابی داؤد' کتاب الطهارة' باب کیف المسح ۔

[مصنف نے موزوں پر مسح کرنے کا جو پہلا طریقہ بیان کیا ہے' اس کی دلیل ذکر نہیں کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فرمان کے مطابق صرف اوپر مسح کرنا ہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔ (مترجم)]

اللہ تعالیٰ نے یہ خون بچے کی نشو ونما کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس کی کم از کم مدت ایک دن' رات اور زیادہ سے زیادہ پندرہ روز ہے۔ لیکن عام طور پر چھ' سات دن آیا کرتا ہے۔ جن ایام میں حیض نہیں آتا انہیں طہر کہتے ہیں۔ طہر کی کم از کم مدت بعض علماء کے نزدیک تیرہ دن اور بعض علماء کے نزدیک پندرہ دن ہے۔ طہر کی زیادہ سے زیادہ مدت کی کوئی حد مقرر نہیں۔ لیکن عام طور پر تیئس' چوبیس دن کا ہوتا ہے۔ اس معاملے میں عورتوں کی تین قسمیں ہیں: مبتداہ' معتادہ اور مستحاضہ۔ ہر ایک کا حکم الگ الگ ہے۔

مبتداہ سے مراد وہ عورت ہے جسے پہلی بار حیض آیا ہو۔ اس کا حکم یہ ہے کہ اسے جب حیض آئے تو نماز' روزہ چھوڑ دے اور مباشرت سے پرہیز کرے اور طہر کا انتظار کرے۔ اگر ایک دن' رات یا اس سے زیادہ اور پندرہ دن سے پہلے پہلے پاک ہو جائے' تو غسل کر کے نماز پڑھنا شروع کر دے۔ لیکن اگر پندرہ دن کے بعد بھی خون جاری رہے تو اسے مستحاضہ سمجھا جائے گا۔ اور اس کا حکم مستحاضہ والا ہوگا۔

اگر پندرہ دن سے پہلے خون میں وقفہ آ جائے' مثلاً ایک دو دن خون آیا اور ایک' دو دن کے لئے بند ہو گیا' اس کے بعد پھر شروع ہو گیا' اس صورت میں جب بھی خون بند ہو گا وہ غسل کر کے نماز پڑھے گی اور جب بھی خون نظر آئے گا نماز' روزہ چھوڑ دے گی۔

معتادہ سے مراد وہ عورت ہے جس کی عادت معلوم ہے کہ اسے ہر ماہ اتنے دن حیض آیا کرتا ہے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ وہ اپنی عادت کے ایام میں نماز' روزہ چھوڑ دے گی اور مباشرت سے پرہیز کرے گی۔ عادت کے ایام گزرنے کے بعد اگر زرد یا مٹیالے رنگ کا پانی آئے' تو اسے حیض نہیں سمجھا جائے گا۔ حضرت اُمّ عطیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''ہم پاک ہونے کے بعد زرد یا مٹیالے رنگ کو کچھ نہیں سمجھتی تھیں۔''(۱)

لیکن اگر عادت کے ایام کے دوران ایسی چیز نظر آئے تو اسے حیض ہی شمار کیا جائے گا۔ لہٰذا غسل کر کے نماز روزہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ (۲)

(۱) صحیح البخاری' کتاب الحیض' باب الصفرة والكدرة في غير ايام الحيض۔

(۲) بعض اہل علم کا خیال ہے کہ اگر عادت سے زیادہ خون جاری رہے تو عورت تین دن تک انتظار کرے' پھر غسل کر کے نماز پڑھے' بشرطیکہ خون کی مدت پندرہ دن سے زیادہ نہ ہو' ورنہ اسے مستحاضہ سمجھا جائے گا۔ اس صورت میں وہ انتظار نہ کرے' بلکہ پندرہ دن پورے ہوتے ہی غسل کر کے نماز شروع کر دے۔ بعض علماء کی رائے ہے کہ عادت سے زیادہ خون آنے پر نماز روزہ نہیں چھوڑنا چاہئے۔ البتہ دو تین بار ایسا ہی ہو تو سمجھا جائے گا کہ عادت بدل گئی۔ لہٰذا اب نئی عادت کے مطابق عمل کرے۔

مستحاضہ وہ عورت ہے جسے استحاضہ کی بیماری ہو' یعنی اس کا خون بند ہی نہ ہوتا ہو۔ اس کا حکم یہ ہے کہ اگر یہ بیماری شروع ہونے سے پہلے اس کی ایک عادت تھی' اور اسے اپنی عادت کے ایام معلوم ہیں' تو وہ ہر مہینے اپنی عادت کے ایام میں نماز' روزہ چھوڑ دے' اور جب وہ دن گزر جائیں تو غسل کر کے نماز روزہ شروع کر دے۔ لیکن اگر اس کی کوئی مقرر عادت نہ رہی ہو' یا عادت ہو لیکن اسے عادت کے ایام یاد نہ رہے ہوں' یا ایام کی تعداد یاد نہ رہی ہو' تو خون کے رنگ سے پہچان کرنی چاہئے۔ یعنی کبھی خون کا رنگ سیاہ اور کبھی سرخ ہو تو سیاہ خون کے ایام میں نماز' روزہ چھوڑ دے۔ اور جب سیاہ خون ختم ہو جائے تو غسل کر کے نماز پڑھے۔

اگر رنگ سے بھی پہچان نہ ہو تو ہر مہینے اتنے دن انتظار کرے جتنا کہ عام طور پر عورتوں کی عادت ہوتی ہے' یعنی چھ یا سات دن۔ اس کے بعد غسل کر کے نماز پڑھے۔

مستحاضہ کو استحاضہ کے ایام میں ہر نماز کے لئے وضو کرنا چاہئے۔ خون روکنے کے لئے کپڑا باندھ لے اور نماز پڑھے' اگر خون بکثرت آ رہا ہو۔ اس بیماری کے دوران عورت سے مباشرت نہیں کرنی چاہئے' اِلّا یہ کہ مجبوری ہو۔

استحاضہ کے مندرجہ بالا احکام کی دلیل مندرجہ ذیل احادیث ہیں:

(۱) حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث: انہوں نے جناب رسول اللہ ﷺ سے اس عورت کے بارے میں مسئلہ پوچھا جسے بیماری کا خون آتا ہو' تو آنحضرتؐ نے فرمایا:

((لِتَنْظُرْ عِدَّةَ اللَّيَالِيْ وَالْاَيَّامِ الَّتِيْ كَانَتْ تَحِيْضُهُنَّ مِنَ الشَّهْرِ قَبْلَ اَنْ يُّصِيْبَهَا الَّذِيْ اَصَابَهَا، فَلْتَتْرُكِ الصَّلَاةَ قَدْرَ ذٰلِكَ مِنَ الشَّهْرِ، فَاِذَا خَلَّفَتْ ذٰلِكَ فَلْتَغْتَسِلْ ثُمَّ لِتَسْتَثْفِرْ بِثَوْبٍ ثُمَّ لِتُصَلِّ))(۱)

''اُسے دیکھنا چاہئے کہ یہ بیماری لگنے سے پہلے اسے کتنے دن حیض آیا کرتا تھا۔ مہینے میں سے اُتنے دن نماز چھوڑ دے' جب وہ دن گزر جائیں تو غسل کرے' پھر ایک کپڑا لنگوٹ کی طرح باندھ لے' پھر نماز پڑھ لے۔''

اس حدیث سے اس مستحاضہ کا حکم معلوم ہوتا ہے جس کی حیض کی عادت معلوم ہو۔

(۲) حضرت فاطمہ بنتِ ابی حبیش رضی اللہ عنہا کی حدیث: انہیں استحاضہ کی بیماری تھی۔ نبی کریم ﷺ نے انہیں فرمایا:

---

(۱) سنن ابی داوٗد' کتاب الطھارۃ' باب فی المرأۃ تستحاض ومن قال تدع الصلاۃ فی عدۃ الایام التی تحیض۔

((اِذَا کَانَ دَمُ الْحَیْضِ فَاِنَّهٗ دَمٌ اَسْوَدُ یُعْرَفُ ، فَاِذَا کَانَ کَذٰلِكَ فَاَمْسِکِیْ عَنِ الصَّلَاةِ ، فَاِذَا کَانَ الْاٰخَرُ فَتَوَضَّئِیْ وَصَلِّیْ فَاِنَّمَا هُوَ عِرْقٌ))[1]

''جب حیض کا خون آتا ہے تو وہ سیاہ ہوتا ہے' پہچانا جاتا ہے' جب (خون) اس طرح کا ہو تو نماز پڑھنے سے رُکی رہ' جب دوسرا (خون) ہو تو وضو (یعنی غسل کے بعد وضو) کر کے نماز پڑھ لے۔ کیونکہ وہ تو ایک رگ ہے۔''

اس حدیث سے اس عورت کا حکم معلوم ہوتا ہے جس کی کوئی مقرر عادت نہیں ہے' یا جسے اپنی عادت یاد نہیں رہی' لیکن جو خون کے رنگ سے پہچان کر سکتی ہے۔

(۳) حضرت حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا کی حدیث: وہ فرماتی ہیں مجھے بکثرت استحاضہ آنے کی سخت بیماری تھی۔ میں مسئلہ پوچھنے کے لئے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّمَا هِیَ رَکْضَةٌ مِنَ الشَّیْطَانِ ، فَتَحَیَّضِیْ سِتَّةَ اَیَّامٍ اَوْ سَبْعَةَ اَیَّامٍ ثُمَّ اغْتَسِلِیْ ، فَاِذَا اسْتَنْقَأْتِ فَصَلِّیْ اَرْبَعَةً وَعِشْرِیْنَ یَوْمًا اَوْ ثَلَاثَةً وَعِشْرِیْنَ یَوْمًا ، وَصُوْمِیْ وَصَلِّیْ ، فَاِنَّ ذٰلِكَ یُجْزِءُكَ ، وَکَذٰلِكَ فَافْعَلِیْ کُلَّ شَهْرٍ کَمَا تَحِیْضُ النِّسَاءُ))[2]

''وہ تو شیطان کی ٹھوکر ہے۔[3] پس تو چھ' سات دن حیض شمار کر' پھر غسل کر لے۔ پھر جب (غسل کے ذریعے) پاک صاف ہو جائے تو تیئیس چوبیس دن نماز پڑھ۔ روزہ بھی رکھ اور نماز بھی پڑھ۔ یہ تیرے لئے کافی ہے۔ تو ہر مہینے اسی طرح کیا کر جس

---

(۱) سنن ابی داوٗد' کتاب الطهارة' باب من قال اقبلت الحیضة تدع الصلاة۔ وسنن النسائی' کتاب الحیض والاستحاضة' باب الفرق بین دم الحیض والاستحاضة۔

(۲) جامع الترمذی' کتاب الطهارة' باب ما جاء فی المستحاضة انها تجمع بین الصلاتین بغسل واحد۔ وسنن ابی داوٗد' کتاب الطهارة' باب من قال : اذا اقبلت الحیضة تدع الصلاة (نحوه)

(۳) امام خطابی فرماتے ہیں: "رکضة" کا لغوی معنی پاؤں سے ضرب لگانا ہے۔ اور اس سے مراد تکلیف پہنچانا اور خرابی پیدا کرنا ہے۔ حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ استحاضہ کی وجہ سے شیطان کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ اس کے دین کے معاملات' اس کی پاکیزگی اور نماز کے اوقات مشکوک کر دے۔ حتیٰ کہ اسے یہ اوقات یاد ہی نہ رہیں۔ اس لحاظ سے یہ معاملہ یوں ہے گویا اسے شیطان نے ٹھوکر مار کر تنگ کیا ہے''۔ معالم السنن۔

طرح عورتوں کی حیض کی عادت ہوتی ہے۔''

اس حدیث سے اس استحاضہ کا حکم معلوم ہوتا ہے جس کی نہ تو عادت معلوم ہو' نہ (خون کے رنگ سے) پہچان ہو سکے۔

(۲) نفاس:

یہ وہ خون ہے جو بچے کی پیدائش کے بعد آتا ہے۔ اس کی کم از کم حد مقرر نہیں۔ نفاس والی عورت جب پاک ہو جائے' تو غسل کر کے نماز شروع کر دے۔ البتہ مباشرت سے چالیس دن تک پرہیز کرنا چاہئے۔ اس دوران مباشرت مکروہ تنزیہی ہے۔ کیونکہ اس سے تکلیف کا خطرہ ہے۔ نفاس کی زیادہ سے زیادہ مدت چالیس دن ہے۔ حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

> ''جناب رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں نفاس والی عورت چالیس دن تک (نماز روزہ سے) پرہیز کیا کرتی تھی۔''(۱)

ایک حدیث میں ہے کہ انہوں نے فرمایا:

> ''میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: جب عورت کے ہاں ولادت ہو تو وہ کتنے دن تک بیٹھ رہے (یعنی نماز روزہ ادا نہ کرے؟) ارشاد ہوا: ''چالیس دن۔ اِلّا یہ کہ اس سے پہلے پاک ہو جائے''۔(۲)

اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ چالیس دن مکمل ہونے پر نفاس والی عورت کو غسل کر کے نماز روزہ ادا کرنا چاہئے اگرچہ خون بند نہ ہوا ہو۔ البتہ خون جاری رہنے کی صورت میں اس کا حکم مستحاضہ والا ہو گا۔

بعض علماء کے نزدیک نفاس کے ایام پچاس یا ساٹھ بھی ہو سکتے ہیں' لیکن چالیس دن کے فتویٰ پر عمل کرنے میں زیادہ احتیاط ہے۔

(۴) طہر کیسے معلوم ہوتا ہے: حیض ختم ہونے کا علم دو طرح سے ہو سکتا ہے' ایک تو وہ سفید پانی جو حیض ختم ہونے پر آتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ مقامِ مخصوص میں روئی رکھے تو خشک نکلے۔ طہر معلوم کرنے کے لئے سونے سے پہلے اور صبح سو کر اٹھنے کے بعد اس طریقہ سے معلوم

---

(۱) جامع الترمذی' کتاب الطھارۃ' باب ما جاء کم تمکث النفساء۔

(۲) سنن ابن ماجۃ' کتاب الطھارۃ و سننھا' باب النفساء کم تجلس۔ اس میں یہ لفظ نہیں کہ ''میں نے پوچھا''۔ امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

کرنا چاہئے تا کہ معلوم ہو کہ حیض ختم ہو کر طہر شروع ہو گیا ہے۔

(۳) حیض ونفاس کے دوران ممنوع اموراور جائز امور

ا) ممنوع امور:

حیض ونفاس کے دوران مندرجہ ذیل امور شرعاً ممنوع ہیں:

(۱) عمل زوجیت: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ﴾ (البقرۃ: ۲۲۲)

''اور عورتوں کے قریب نہ جاؤ حتیٰ کہ وہ پاک ہو جائیں۔''

(۲) نماز' روزہ: لیکن پاک ہونے کے بعد روزہ کی قضا دی جائے گی' جبکہ نماز معاف ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((أَلَيْسَ إِذَا حَاضَتِ الْمَرْأَةُ لَمْ تُصَلِّ وَلَمْ تَصُمْ))(۱)

''کیا ایسا نہیں ہے کہ جب عورت ایام سے ہوتی ہے تو نماز نہیں پڑھتی اور روزہ نہیں رکھتی؟۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ مسئلہ پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: ''ہم پر یہ حالت (حیض کی حالت) آتی تھی تو ہمیں روزہ کی قضا کا حکم دیا جاتا تھا اور نماز کی قضا کا حکم نہیں دیا جاتا تھا''۔(۲)

(۳) مسجد میں داخل ہونا: آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((لَا أُحِلُّ الْمَسْجِدَ لِحَائِضٍ وَلَا جُنُبٍ))(۳)

''میں حائضہ اور جنبی کے لئے مسجد حلال نہیں کہتا۔''

(۴) قرآن مجید کی تلاوت: حدیث نبویؐ ہے:

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الحیض' باب ترك الحائض الصوم۔

(۲) صحیح مسلم' کتاب الحیض' باب وجوب قضاء الصوم علی الحائض دون الصلاۃ۔ وصحیح البخاری' کتاب الحیض' باب لا تقضی الحائض الصلاۃ (نحوہ)

(۳) سنن ابی داوٗد' کتاب الطھارۃ' باب فی الجنب یدخل المسجد۔

((لَا یَقْرَأُ الْجُنُبُ وَلَا الْحَائِضُ شَیْئًا مِّنَ الْقُرْآنِ))[١]

''جنبی اور حائضہ قرآن مجید سے کچھ نہ پڑھیں۔''

(۵) طلاق: عورت کو حیض کے ایام میں طلاق دینا درست نہیں' بلکہ انتظار کیا جائے حتیٰ کہ وہ پاک ہو جائے۔ پاک ہونے کے بعد ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دی جائے۔ حدیث میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنی زوجہ کو طلاق دے دی' جب کہ وہ ایامِ حیض میں تھیں' تو آنحضرت ﷺ نے حضرت عبداللہؓ کو حکم دیا کہ انہیں واپس لے آئیں اور پاک ہونے تک اپنے پاس رکھیں''۔ [٢]

ب) جائز امور:

حیض اور نفاس کے دوران مندرجہ ذیل امور جائز ہیں:

(۱) عمل مخصوص کے علاوہ عورت سے استمتاع' مثلاً ساتھ لیٹنا یا بوس و کنار وغیرہ۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

((اِصْنَعُوْا کُلَّ شَیْءٍ اِلَّا النِّکَاحَ))[٣]

''جماع کے علاوہ سب کچھ کر سکتے ہو۔''

(۲) اللہ کا ذکر: کیونکہ اس کی ممانعت کی کوئی دلیل نہیں آئی۔

(۳) احرام باندھنا' عرفات میں ٹھہرنا اور حج اور عمرہ کے دیگر اعمال: البتہ بیت اللہ شریف کا طواف پاک ہو کر' غسل کر کے ہی کر سکتی ہے۔ کیونکہ جناب رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا:

((اِفْعَلِیْ مَا یَفْعَلُ الْحَاجُّ غَیْرَ اَنْ لَّا تَطُوْفِی الْبَیْتَ حَتّٰی تَطْھُرِیْ))[٤]

''وہ تمام کام کرو جو حاجی کرتا ہے لیکن بیت اللہ کا طواف نہ کرنا' جب تک پاک نہ

---

(١) جامع الترمذی' ابواب الطھارۃ' باب ما جاء فی الجنب والحائض انھما لا یقرآن القرآن۔

(٢) صحیح البخاری' کتاب الطلاق' باب قول اللہ تعالیٰ: ﴿یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْھُنَّ لِعِدَّتِھِنَّ﴾

(٣) صحیح مسلم' کتاب الحیض' باب جواز غسل الحائض رأس زوجھا وترجیله وطھارة سؤرھا والاتکاء فی حجرھا وقراءة القرآن فیه۔

(٤) صحیح البخاری' کتاب الحیض و کتاب الحج' باب تقضی الحائض المناسك کلھا الا الطواف بالبیت۔ و صحیح مسلم' کتاب الحج' باب بیان وجوہ الاحرام ......

ہو جاؤ۔"

(۴) اس کے ساتھ مل کر کھانا پینا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد ہے:

"میں حیض سے ہوتی تھی۔ میں پانی پیتی اور برتن نبی ﷺ کو دے دیتی' تو آپؐ میرے منہ کی جگہ اپنا منہ رکھ کر پانی پی لیتے"۔ (۱)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"میں نے نبی ﷺ سے حائضہ عورت کے ساتھ مل کر کھانا کھانے کے متعلق سوال کیا تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اس کے ساتھ کھالیا کرو"۔ (۲)

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب الحیض' باب جواز غسل الحائض رأس زوجها ...... الخ۔

(۲) جامع الترمذی' ابواب الطهارة' باب ما جاء فی مواکلة الحائض وسؤرها۔ شیخ احمد محمد شاکر نے اس حدیث کو "حسن" کہا ہے۔

علوم قرآنیہ و نبویہ کے شائقین کے لئے

بشارت عظمیٰ

بذریعہ ڈاک گھر بیٹھے طلباء/طالبات کورس کر کے سند حاصل کریں.

اپنی نوعیت کا منفرد سلسلہ ہر مسلمان کی اولین ضرورت

تفسیر قرآن مقدس کا ایک سالہ کورس	ترجمۂ قرآن کا سہ ماہی کورس	تجوید و قراءت (قاری معلم/معلمہ) ایک سالہ کورس
سہ ماہی قواعد التجوید قدری/قدریہ ٹیچر ٹریننگ کورس	فاضل عربی عربی معلم/معلمہ ایک سالہ کورس	ششماہی حدیث نبوی کورس
سہ ماہی فہم قرآن کورس	سہ ماہی تعلیم النساء کورس	سہ ماہی عربی لینگویج کورس

پراسپیکٹس و داخلہ فارم کیلئے، 20 روپے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کریں.

ڈاک کا ایڈریس، مشتاق الرحمٰن عثمانی۔ پوسٹ بکس نمبر 3357

کراچی نمبر 43۔ پوسٹ کوڈ نمبر 75210۔ موبائل: 0320-4076874

اسلام کی بنیادی اقدار

مولانا سید وصی مظہر ندوی

انسان جو کام کرتا ہے ان میں سے کچھ کام اچھے ہوتے ہیں اور کچھ کام برے۔ کسی عمل کو وہ خیر تسلیم کرتا ہے اور کسی عمل کو شر قرار دیتا ہے۔ یہ تقسیم انسان کی فطرت کا عین تقاضا ہے۔ حیوانوں میں سے کسی اور حیوان میں اس تقسیم کا کوئی شعور نہیں پایا جاتا۔ اس لحاظ سے انسان کو اخلاقی حیوان کہنا بجا ہوگا۔

لیکن خیر وشر اور معروف ومنکر کی یہ تقسیم اگرچہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے لیکن انسانوں کے درمیان بہرحال اس سلسلہ میں کئی بنیادی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ کسی عمل کے خیر یا شر ہونے کی کسوٹی کیا ہے؟ یا یہ کہ کون سے اخلاق بنیادی ہیں جن کے اوپر دوسرے اخلاقی اوصاف قائم ہوتے ہیں اور کون سے اخلاق ثانوی درجہ رکھتے ہیں جن کو بنیادی اخلاق کے مقابلے میں اگر قربان کرنا پڑے تو قربان کیا جاسکتا ہے۔

اسی اختلاف کی وجہ سے انسان مختلف ساجوں اور تہذیبوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ انسانوں کے لئے جو بھی نظامِ زندگی ترتیب دیا جائے گا اس میں اچھے اور برے اخلاق اور خوب وناخوب میں فرق کرنے کے لئے کچھ بنیادی قدریں ضرور طے کی جائیں گی۔ کیونکہ ان ہی بنیادی قدروں کی کسوٹی پر اس تہذیب اور نظام کی گود میں پلنے والے سماج کے ہر انفرادی اور اجتماعی عمل کو پرکھا جاتا ہے۔

اسلام امن اور سلامتی کا علمبردار ہے، اخوت اور ہمدردی کا دین ہے، عدل اور مساوات کا قیام اس کے بنیادی مقاصد میں سے ہے۔ لیکن ان تمام اعلیٰ اقدار کا محافظ ہونے کے ساتھ ساتھ سوال یہ ہے کہ اسلامی تہذیب کی بنیادی قدریں کون سی ہیں؟ اس سوال کا جواب ہر مفکر نے اپنی فکر کے مطابق دیا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ جامع اور شریعت اسلامی کے گہرے مطالعہ پر مبنی جواب وہ ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے دیا ہے۔ ان کی بحث کا

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کی بنیادی قدریں چار ہیں۔طہارت' اخبات' سماحت اور عدالت۔

انسان فطری طور پر گندگی کو ناپسند کرتا ہے۔ پاکیزگی اور صفائی کو پسند کرتا ہے۔انسان کے اس فطری تقاضے کے تحت اسلام نے ظاہری اور باطنی نجاست اور گندگی سے دور رہ کر صفائی اور پاکیزگی کو اختیار کرنے کے لئے جامع احکام اور ہدایات جاری کی ہیں۔ چنانچہ جسم اور لباس کی پاکیزگی' وضو اور غسل کے احکام اور خوشبو وغیرہ کے استعمال کی ہدایات کا ایک وسیع باب اسلامی شریعت میں موجود ہے۔انسان جب طہارت حاصل کر لیتا ہے تو اس کا باطنی نور مادی اندھیروں سے گزر کر اپنے خالق' مالک اور پروردگار کی معرفت حاصل کر لیتا ہے۔

اس معرفت کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان اپنے ربّ کی عظمت کے نور اور اپنے ضعف و مسکنت کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔اس کی وجہ سے اخبات کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔یعنی اپنے ربّ کی عظمت کے سامنے سر جھکا دینا' عاجزی اور تذلل اختیار کرنا۔اس کیفیت کا پہلا درجہ اسلام ہے۔یعنی اپنے آپ کو پروردگار کے حوالے کر دینا اور اس کی اطاعت اور فرماں برداری کو اختیار کر لینا۔ دوسرا درجہ تقویٰ ہے'یعنی اپنے ہر ایسے قول یا عمل سے بچنا جو پروردگار کی ناراضگی کا سبب بن سکتا ہو۔اخبات کا تیسرا اور اعلیٰ مرتبہ ''احسان'' ہے۔احسان کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت اتنے اچھے طریقے پر کی جائے کہ گویا بندہ اپنے مالک کو دیکھ رہا ہے۔

اخبات کی صفت میں آدمی جتنا بڑھتا جاتا ہے اس میں اسی قدر سماحت کی صفت پیدا ہوتی ہے۔یعنی دنیا اور متاع دنیا کی محبت سے آدمی کا دل خالی ہو جاتا ہے۔وہ یہاں کے تمام ساز و سامان کو استعمال تو ضرور کرتا ہے مگر اُن کے عشق میں مبتلا نہیں ہوتا' اور جب بھی اس کو دنیا کی کسی شے سے ہاتھ اٹھانا پڑتا ہے تو اس طرح ہاتھ اٹھا لیتا ہے کہ اس کے دل میں اس چیز کو چھوڑنے کا ذرا بھی ملال نہ ہو۔یعنی مؤمن اس ''بُت خانۂ رنگ و بو'' کو اپنے جال میں گرفتار کر لیتا ہے اور اس سے اپنی خدمت لیتا ہے۔سماحت کی صفت پیدا ہونے سے انسان کے اندر راہِ خدا میں صرف کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے' دوسروں کے حقوق خوش دلی سے ادا کرتا ہے' اس میں ایثار کی صفت پیدا ہوتی ہے اور جان و مال کی ہر قربانی دینا اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے۔

سماحت کی اس صفت کی تخلیق' تربیت اور تقویت کے لئے نظامِ اسلام میں احکام'

قوانین اور ہدایات کا ایک وسیع باب موجود ہے۔زکوٰۃ کی فرضیت' صدقاتِ واجبہ' قربانی' رشتہ داروں' پڑوسیوں' مہمانوں' مسافروں اور دوستوں کے حقوق کی تاکید' راہِ خدا میں جان و مال کی قربانی دینے کا مطالبہ اسی بنیادی قدر یعنی سماحت کا تقاضا ہیں۔

اسلامی نظام کی چوتھی بنیادی قدر عدالت ہے' جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اعمال کا محرک ذاتی مفادات کا حصول نہ ہو' بلکہ آدمی جو کچھ کرے کسی اعلیٰ مقصد یا اجتماعی مفاد کے حصول کے لئے کرے' حتیٰ کہ اپنے نفس کے تقاضے بھی اس نیت کے ساتھ پورے کرے کہ نفس کے یہ حقوق اللہ تعالیٰ نے متعین فرمائے ہیں اور ان حقوق کو ادا کر کے وہ اپنے فرائض بہتر طور پر ادا کر سکتا ہے۔عدالت کی بنیادی قدر کے نتیجہ میں معاشرے میں عدل کا قیام' حقوق سے زیادہ فرائض کی ادائیگی کی جانب توجہ اور نفسی نفسی کے بجائے ایثار اور خدا ترسی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

طہارت' اخبات' سماحت اور عدالت کو اسلام میں بنیادی اقدار کی حیثیت حاصل ہے۔ انہی قدروں کے معیار پر ہر قول و عمل کی قدر و قیمت معین کی جاتی ہے۔حتیٰ کہ وہ تمام نیکیاں اور سچائیاں جن کو تمام انسان اپنے فطری تقاضے کے طور پر نیکی اور سچائی مانتے ہیں وہ بھی اسی وقت نیکی اور سچائی قرار پاتی ہیں جب وہ ان بنیادی قدروں سے ہم آہنگ ہوں۔اسی طرح سے جن کاموں کو برا سمجھا جاتا ہے وہ اسی وقت برے تصور کئے جائیں گے جب وہ ان بنیادی اقدار سے ٹکراتے ہوں۔

صداقت' شجاعت' سخاوت اور عفت کو تقریباً تمام نظاموں میں اعلیٰ اخلاقی قدر کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ان اوصاف کے برعکس جھوٹ' بزدلی' بخل اور بے راہ روی کو ہر نظام میں برا سمجھا جاتا ہے۔لیکن ہر نظام کی طرح اسلام میں بھی ان کی قدر و قیمت کا تعین اسلام اپنی بنیادی اقدار کی روشنی میں کرتا ہے۔غرضیکہ اسلامی نظامِ زندگی کو دوسری تہذیبوں سے ممتاز کرنے والی قدریں یہی ہیں۔

وضاحت

''مسلمان کا طرزِ حیات'' کے عنوان سے میثاق کے صفحات میں علامہ ابوبکر الجزائری کی کتاب ''منہاج المسلم'' کا اردو ترجمہ بالاقساط شائع کیا جا رہا ہے۔واضح رہے کہ ''کتاب الآداب'' میں غسل اور تیمم وغیرہ کے جو مسائل بیان ہوئے ہیں یہ فقہ حنفی کے مطابق نہیں ہیں۔

حیاتِ دُنیوی ـــــ ایک انمول تحفہ

تحریر: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

خالق کائنات حکیم مطلق ہے۔ جس طرح اُس کی ذات بے مثل اور بے مثال ہے اسی طرح اُس کی صفات بھی لامحدود وسعت کی حامل ہیں۔ الحکیم بھی اس کی ایک صفت ہے' جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسا دانا ہے کہ اس کا کوئی کام بھی عبث اور فضول نہیں۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ط ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ (ص:۲۷) ''ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے بے مقصد پیدا نہیں کیا' بلکہ ایسا تو اُن لوگوں کا خیال ہے جنہوں نے انکار کیا''۔ اس کے علاوہ اگر ذرا غور کریں تو یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ سارے داناؤں سے بڑے بلکہ سب داناؤں کے خالق سے یہ بات کیسے ممکن ہے کہ وہ کوئی فضول کام کرے۔ اپنے اردگرد کے ماحول میں ہم اُسی شخص کو عقلمند کہتے ہیں جس کے مشاغل اور مصروفیات نتیجہ خیز (Productive) اور مثبت ہوں اور اُس شخص کو بے وقوف کہتے ہیں جو عاقبت نااندیشی' کوتاہ نظری اور کم فہمی کی بنا پر ایسے کام کرے جو عدل وانصاف کے خلاف اور نتیجتاً ضرر رساں ہوں یا بے فائدہ ہوں۔ قرآن مجید میں اللہ کے نیک بندوں کی دعا کے الفاظ آئے ہیں جہاں وہ دعا مانگنے کے دوران اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا﴾ (آل عمران:۱۹۱) ''اے ہمارے پروردگار! تو نے یہ سب کچھ باطل (بے کار) پیدا نہیں کیا''۔

یوں ہمارا اس بات پر پختہ یقین ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات بامقصد پیدا کی ہے اور اس میں کوئی شے بھی فضول اور بے کار پیدا نہیں کی۔ یہاں یہ سوال کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ مخلوقات میں بعض ایسی انواع بھی ہیں جن میں صرف ضرر کا پہلو ہی نمایاں نظر آتا ہے' کیونکہ ہمارا فہم وادراک ہر شے کی حقیقت معلوم کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ عقل وشعور اور بیانِ مدعا کی صلاحیت کے علاوہ انسان کی' جو اشرف المخلوق ہے' ہر صلاحیت میں بعض حیوانات' چرند اور پرند کو اس پر فوقیت حاصل ہے۔ عقاب کی قوتِ

بصارت' کتے کی قوتِ شامہ' گھوڑے کی قوتِ سماعت انسان کی قوتوں سے کہیں بہتر ہیں۔ پھر انسان کیسے اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ اسے کائنات کی ہر شے کی کنہ کا علم ہے۔

جب یہ بات طے ہوئی تو تخلیق کائنات کا مقصد سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ﴾ (الجاثیة: ۱۳) ''اور اس نے تمہارے کام میں لگا دیا اپنی طرف سے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب''۔ گویا مخلوقات کی ہر نوع انسان کی خدمت میں لگی ہوئی ہے جبکہ انسان کو اشرف المخلوق کے منصب پر فائز کر کے مخدومِ کائنات بنا دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ﴾ (الاسراء: ۷۰) ''اور ہم نے اولادِ آدم کو شرفِ فضیلت بخشا''۔ مشاہدہ اس بات کا گواہ ہے کہ بیل' گائے' فاختہ' کبوتر' مرغا' ہرن وغیرہ انسان ہی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں کہ ان کا گوشت کھائے۔ گھوڑے' گدھے' اونٹ وغیرہ پیدا کئے کہ ان سے سواری کا کام لے۔ اناج اور پھل پیدا کئے جو انسان کے کام و دہن کی تسکین کا سامان لئے ہوئے ہیں۔ خوش نما مناظر اور پھول پیدا کئے جو انسانی آنکھوں کے لئے راحت کا باعث ہیں۔ ہاں مخلوق کی کچھ ایسی انواع بھی ہیں جن کے بارے میں ابھی تک انسان معلوم نہیں کر سکا کہ وہ کس اعتبار سے انسان کے لئے مفید ہیں۔ کچھ ایسی چیزیں ہیں جن کا نقصان کا پہلو نمایاں ہے' اُن میں پائی جانے والی خوبی بھی انسان نے معلوم کر لی ہے۔ مثلاً چھپکلی گھر کے کیڑے مکوڑوں کو کھا کر ختم کرتی ہے' وغیرہ۔ اسی طرح بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کا نفع انسان پر ابھی تک واضح نہیں' لیکن اللہ کی مخلوق ہونے کے ناطے ضرور اُن میں انسان کے نفع کا پہلو موجود ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کوئی مخلوق عبث پیدا نہیں کی۔ لازماً اللہ تعالیٰ نے کسی مصلحت کے تحت ہی کچھ چیزوں کے استفادی پہلو کو خفیہ رکھا ہے۔

چاند' سورج' پہاڑ' غرض مخلوق کی ہر نوع کے اندر انسانی مفادات رکھ کر اور اُن کو انسان کے لئے مسخر کر کے اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزمائش میں ڈال دیا اس وعدے پر کہ اگر وہ اس آزمائش پر پورا اترے گا تو اُسے ایسی ابدی راحتوں سے نوازا جائے گا جو اُس کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آ سکتیں۔ بصورت دیگر اُسے عذاب الٰہی میں مبتلا رہنا پڑے گا۔ بس عقل مند وہی لوگ ہیں جو اِس امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے مسلسل جدوجہد کر رہے ہیں اور ناکام وہ ہیں جو اس دنیا کی چمک دمک اور کشش میں منہمک ہو کر اپنے مقصد تخلیق کو فراموش کئے بیٹھے ہیں۔

یہ امتحان کس نوعیت کا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زندگی گزارنے کا لائحۂ عمل قرآن مجید کی صورت میں دے دیا ہے۔ اس میں حقیقی کامیابی حاصل کرنے کا اجمالی خاکہ موجود ہے۔ قرآن وہ واحد کتاب ہے جو کسی ادنیٰ تغیر و تبدل سے بھی پاک ہے۔ اس کے علاوہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ یوں اس کی ہدایات پر بغیر کسی تردّد اور تأمل کے عمل کیا جا سکتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب اپنے برگزیدہ بندے حضرت محمد ﷺ پر بذریعہ وحی نازل کی جنہوں نے اس پر عمل کر کے دکھا دیا۔ یوں ہم علم قرآن سے لیں گے اور عمل رسول اللہ ﷺ سے۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کریں۔ یہی اطاعت اللہ کی اطاعت ہوگی۔ ارشادِ الٰہی ہے:
﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (النساء: ۸۰) ''جو رسول کی اطاعت کرتا ہے اس نے گویا اللہ ہی کی اطاعت کی''۔ کیونکہ رسول کی حیثیت اللہ تعالیٰ کے نمائندے کی ہوتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنی ساری زندگی خالصتاً اللہ کی اطاعت میں گزاری۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کی زندگی کو بنی نوع انسان کے لئے بہترین نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب: ۲۱) ''بے شک تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں کامل نمونہ موجود ہے''۔ پس رسول اللہ ﷺ کی مثالی زندگی کے مطابق زندگی بسر کرنا بلاشبہ کامیابی کی دلیل ہے اور اس راستے کو چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا سراسر ناکامی اور نامرادی ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ (آل عمران: ۸۵) ''اور جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرتا ہے پس وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور ایسا شخص آخرت کی زندگی میں ناکام و نامراد لوگوں میں شامل ہوگا''۔ بقول شاعر ؎

خلاف پیمبر کسے راہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

''جس نے پیغمبر کے خلاف راستہ اختیار کیا وہ کبھی منزل تک نہیں پہنچے گا''۔

قرآن و سنت کے مطابق زندگی گزارنے میں جو رکاوٹیں اور دشواریاں پیش آتی ہیں دین اسلام میں اُن کی واضح طور پر نشاندہی کر دی گئی ہے۔ سب سے پہلی رکاوٹ تو ابلیس ہے جو انسان کو سیدھے راستے پر چلنے سے روکتا ہے۔ وہ بڑا دھوکے باز ہے۔ اسی لئے قرآن مجید میں بتا دیا گیا کہ شیطان کے دھوکے سے بچ کر رہنا۔ ارشاد ہے: ﴿وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ﴾ (لقمان: ۳۳) ''اور وہ بڑا دھوکے باز اللہ کے معاملے میں تمہیں دھوکے میں نہ

ڈال دے۔'' یوں شیطان بنی آدم کا بدترین دشمن ہے۔ وہ سبز باغ دکھاتا' روشن مستقبل کا لالچ دیتا اور بڑے مؤثر انداز میں دھوکا دیتا ہے۔ اس کا حملہ غیر محسوس انداز کا ہوتا ہے' کیونکہ وہ سامنے نہیں آتا' بلکہ دل میں وسوسے ڈالتا ہے۔ چونکہ وہ ہر چھوٹے بڑے' غریب امیر' نیک و بد کے ساتھ یکساں عداوت رکھتا ہے اس لئے اس کے حملے سے کوئی محفوظ نہیں۔ چنانچہ اس کے حملے سے بچ کر رہنے کی تلقین کی گئی ہے اور اُس کی چال پر لگنے کے نتائج بد سے بار بار آگاہ کیا گیا ہے۔ شیطان کے وار سے بچنا بہت مشکل ہے۔ اسی لئے اُس کے فریب سے بچ کر زندگی گزارنے والے کے لئے طرح طرح کے انعامات کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اسلام ہمیں تعلیم دیتا ہے کہ ہم ہر وقت چوکنے (Vigilant) رہیں' مبادا شیطان ہمیں غلط راستے پر لگا کر گمراہ کر دے۔ کتنے ہی اولیاء و صلحاء ایسے گزرے ہیں جو شیطان کے دھوکے میں آ کر اپنا سب کچھ گنوا بیٹھے۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ﴾ (الاعراف:۱۷۵) ''پس وہ شخص شیطان کے پیچھے چل پڑا اور بالآخر گمراہوں میں شامل ہو گیا''۔ اس آیت کی تفسیر میں بتایا گیا ہے کہ وہ شخص بنی اسرائیل کا بڑا عالم اور صاحب تصرف درویش ''بلعم بن باعوراء'' تھا جو شیطان کے حملے کا مقابلہ نہ کر سکا اور تمام زندگی کی نیکیاں اور عبادتیں ضائع کر بیٹھا۔ اسی لئے اسلام نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے شیطانِ مردود کے شر سے پناہ مانگا کریں اور کہیں: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ''میں اللہ کی پناہ میں آتا ہوں شیطان مردود (کے شر) سے''۔ خاص طور پر جب قرآن کی تلاوت کریں تو آغاز سے پہلے تعوذ پڑھ لیں' تا کہ قرآن سے ہدایت حاصل کرنے میں شیطان رکاوٹ نہ بن سکے۔

دنیا میں اس انداز سے زندگی گزارنا کہ عاقبت کی زندگی سنور جائے' اس راستے میں ایک بڑی رکاوٹ خود فریبی یا خواہش نفس بھی ہے۔ انسان کا نفس اسے برائی پر آمادہ کرتا ہے۔ وہ لالچ میں پڑ کر جلد بازی کر کے دنیاوی مفادات حاصل کرنا چاہتا ہے اور یہ بات فراموش کر دیتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کو نظر انداز کر کے وہ خسارے کا سودا کر رہا ہے۔ یقیناً نبی ﷺ کی نافرمانی گمراہی کی طرف لے جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰى﴾ (النساء:۱۳۵) ''پس تم خواہش نفس کی پیروی نہ کرو''۔ کیونکہ خواہش نفس کی پیروی تو نری ہلاکت ہے۔ یعنی کوئی کام انجام دیتے وقت یہ ضرور دیکھ لو کہ یہ کام اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے خلاف تو نہیں۔ اگر خلاف ہے تو یقیناً خواہش نفس

اس کی محرک ہے اور یہ کام امتحان میں ناکامی کی طرف لے جائے گا۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ﴾ (القصص: ۵۰) ''اور اس شخص سے زیادہ گمراہ کون ہے جو اللہ کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی خواہش پر چلے''۔

ہر شخص کے اندر نفسانی خواہشات ہیں۔ اللہ کے برگزیدہ رسول حضرت یوسف علیہ السلام پکار اٹھے تھے: ﴿وَمَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ ۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ؕ﴾ (یوسف: ۵۳) ''اور میں اپنے نفس کو بری الذمہ نہیں کہتا۔ بے شک نفس تو برائی پر ابھارتا ہی ہے' مگر میرے ربّ نے ہی مجھ پر رحم کیا''۔ پس نفسانی خواہشات کی بے دریغ اور آزادانہ تکمیل امتحان میں ناکامی کا بہت بڑا سبب ہے۔ اس کے برعکس اپنی خواہشات کو احکامِ شریعت کے تابع رکھنا ہی حقیقی کامیابی ہے۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝﴾ (النّٰزعٰت: ۴۰'۴۱) ''اور جو کوئی ڈرا اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے سے اور اُس نے اپنے نفس کو خواہش سے روکا تو بلاشبہ ایسے ہی لوگوں کا ٹھکانہ جنت ہے''۔

دنیاوی زندگی امتحانی وقفہ ہے۔ دیکھا جائے گا کہ کون اس میں اچھے عمل کرتا ہے اور کامیاب ٹھہرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ﴾ (الملک: ۲) ''اُس نے موت اور حیات پیدا کی تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ کون اچھے عمل کرتا ہے''۔ ایک شخص اپنی مالی حالت بہتر کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس سلسلہ میں بھاگ دوڑ کرتا ہے۔ اُس کے سامنے روزی کمانے کے کئی Options آتے ہیں۔ اگر وہ ایسے پیشے کو اختیار کرتا ہے جہاں سے دولت تو آتی ہے مگر وہ پیشہ اختیار کرنا جائز نہیں اور دولت کے لالچ میں وہ شریعت کی پابندی چھوڑ بیٹھا تو نفع کے بجائے حقیقی نقصان میں پڑ گیا۔ کیونکہ جس شخص نے ناجائز دولت کے ذریعے حیاتِ دُنیوی کی ہر آسائش اکٹھی کر لی اور ''بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' کے نظریئے کے تحت عیش وعشرت اور لہو ولعب میں پڑ کر نافرمانی میں زندگی گزاری تو اُس نے بہت خسارے کا سودا کیا۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ۝ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝﴾ (النّٰزعٰت: ۳۷ تا ۳۹) ''اور البتہ جس کسی نے سرکشی اختیار کی اور دنیا کی زندگی پر ریجھ گیا' بے شک اُس کا ٹھکانہ جہنم ہے''۔

یوں دنیا کی زندگی کے ہر لمحے سے فائدہ اٹھانا چاہئے اور تضییع اوقات سے اجتناب کرنا

چاہئے۔ خودکشی اسی لئے حرام ہے کہ اوّل خودکشی کرنے والا زندگی کے لحات کی قدر و قیمت سے آگاہ نہیں رہتا' دوسرے وہ ناسازگار حالات سے گھبرا کر مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے' حالانکہ مایوسی کسی وقت بھی جائز نہیں۔ حالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ﴾ ''اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ''۔

زندگی کے لحات کی قدر و قیمت جاننے کے لئے اُس واقعے پر غور کیجئے جو عہد نبویؐ میں پیش آیا۔ دو شخصوں کے درمیان آپؐ نے اخوت کا رشتہ قائم فرما دیا۔ اُن میں سے ایک صاحب جہاد میں گئے اور شہید ہو گئے۔ پھر اس کے ہفتہ یا عشرہ بعد دوسرے صاحب کا بھی انتقال ہو گیا۔ صحابہ نے ان کی نماز جنازہ پڑھی۔ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں سے پوچھا کہ آپ لوگوں نے اپنے بھائی کے بارے میں کیا دعا کی؟ انہوں نے عرض کی کہ ہم نے اُس کے لئے یہ دعا کی کہ اللہ اس کی مغفرت فرمائے' اُس پر رحمت فرمائے اور اللہ تعالیٰ اُس کو اپنے شہید بھائی کے ساتھ ملائے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''پھر اس کی وہ نمازیں کہاں گئیں جو اُس نے اپنے شہید ہونے والے بھائی کے بعد پڑھیں اور دوسرے اعمالِ خیر کہاں گئے جو اُس شہید کے اعمال کے بعد اس نے کئے؟'' اس کے بعد آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ان دونوں کے مقامات میں تو اس سے بھی زیادہ فاصلہ ہے جتنا کہ زمین و آسمان کے درمیان ہے''۔ (ابوداؤد و نسائی)

شہید کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اسی لئے صحابہ کرامؓ نے بعد میں طبعی موت مرنے والے کے لئے شہید بھائی کی معیت کی دعا کی۔ مگر آپ ﷺ نے فرمایا کہ طبعی موت مرنے والے کا مقام تو شہید بھائی سے بہت بلند ہو گیا ہے' کیونکہ اس کی نیت بھی جہاد میں شہادت پانے کی تھی مگر اس کو موقع نہ ملا۔ پس حسنِ نیت کی بنا پر اس شخص کو بھی شہادت کا رتبہ تو مل گیا مگر جو دن شہید کی شہادت کے بعد اس شخص کو ملے اس دوران اُس نے جو نمازیں پڑھیں اور نیک عمل کئے وہ شہید ہونے والا تو نہ کر سکا۔ لہٰذا ان دنوں کے اعمال نے اس طبعی موت مرنے والے کا مقام شہید سے بھی بلند کر دیا۔ معلوم ہوا کہ ہر دن جو طلوع ہوتا ہے مسلمان کی زندگی میں بہت اہم ہوتا ہے۔ وہ اس دن میں نمازیں پڑھ کر اور دوسرے نیک اعمال کر کے ڈھیروں اُخروی نفع کما سکتا ہے۔ مسلم شریف کی ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں:

((كُلُّ النَّاسِ يَغْدُوْ فَبَائِعٌ نَفْسَهٗ فَمُعْتِقُهَا اَوْ مُوْبِقُهَا))

''ہر انسان صبح کو نکلتا ہے تو وہ اپنی جان کو بیچتا ہے' پھر یا تو اُسے آزاد کرا لیتا ہے

(عذاب سے) یا پھر ہلاک کرڈالتا ہے''۔

ایک دفعہ ایک شخص نے رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر دریافت کیا کہ آدمیوں میں کون بہتر ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''وہ جس کی عمر لمبی ہوئی اور اُس کے اعمال اچھے رہے''۔ پھر اس نے پوچھا کہ آدمیوں میں بدترین کون ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس کی عمر لمبی ہوئی اور اعمال برے ہوئے''۔ (مسند احمد) پس نیک اعمال کے ساتھ لمبی عمر بڑے نصیبے کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں زندگی کے یہ مختصر لمحات اپنی رضا کے مطابق گزارنے کی توفیق دے۔ آمین!

چلڈرن قرآن سوسائٹی کے زیر اہتمام

طالب علموں کے لئے ایک معیاری علمی رسالہ

ماہنامہ **کوثر** لاہور

حکومت پنجاب سے منظور شدہ SO(PI)45/83

مسلسل اشاعت کا اکیسواں سال

مستقل عنوانات:

آپس کی باتیں، سرورق کی زبانی، حمد، نعت، درس قرآن، تاریخ اسلام، منتخب تحریر، مکالمہ، صحت .... اس کے علاوہ

ہر تازہ شمارے میں تازہ بتازہ مضامین

☆ قیمت فی شمارہ: 10 روپے ☆ سالانہ زرتعاون: 100 روپے

تعارف کے لئے آئندہ شمارہ مفت طلب کریں

چلڈرن قرآن سوسائٹی

خواجہ آرکیڈ، 17۔ وحدت روڈ لاہور فون: 7598565

’’اقامتِ دین کی جدوجہد فرضِ عین ہے!‘‘
چند اشکالات اور اُن کے جوابات

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب!
السلام علیکم

عرصہ دراز کے بعد آپ سے سلسلہ جنبانی کا ارادہ ہوا..... گزشتہ ڈیڑھ دو سال کے دوران میں نے شاہ ولی اللہ‘ ابوالحسن علی ندوی‘ سید قطب شہید‘ علامہ مشرقی‘ علی عزت بیگووچ‘ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی‘ جاوید احمد الغامدی‘ الطاف جاوید‘ ڈاکٹر افتخار آغا‘ کانٹ کا فلسفہ‘ گبن کی تاریخ‘ ابن خلدون کا مقدمہ اور امام غزالی کی احیاء العلوم کا مطالعہ کیا۔ پروفیسر محمد اجمل خاں کے نظریہ ’’قرآن کی ترتیب نزولی‘‘ کو سمجھنے کا موقع ملا۔ اس ساری تمہید کا مقصد یہ ہے کہ دورانِ مطالعہ مجھے آپ کے اس احسان کا شدت سے احساس ہوا کہ اگر آپ کی رفاقت میسر نہ ہوتی تو ان دقیق کتابوں کو کبھی نہ سمجھ سکتا۔ قرآن حکیم کا ۲۵ سالہ مطالعہ مفکرین کے فکری جھول کو بھی واضح کرنے میں مدد معاون ثابت ہوا‘ جس پر راقم آپ کا شکر گزار ہے۔

آپ کی احسان مندیوں کا تقاضا ہے کہ آپ کی جو چیزیں سمجھ میں نہ آئیں وہ آپ سے پوچھوں اور اپنی رائے بھی دوں۔

ہمدرد ہال راولپنڈی میں آپ نے اپنی فکر کا صغریٰ کبریٰ درج ذیل انداز میں بیان کیا:

۱) اقامت دین کی جدوجہد فرضِ عین ہے۔
۲) اس جدوجہد کے لئے جماعت لازم ہے۔
۳) اس جماعت کا نظم ایسا ہونا چاہئے کہ اس کے امیر کے ہاتھ پر بیعت سمع و طاعت فی المعروف لازم ہو۔

مندرجہ بالا تنقیحات سے جو سوالات پیدا ہوتے ہیں ان کا جواب مطلوب ہے:

۱) فرض عین کسے کہتے ہیں؟

۲) جو مسلمان مندرجہ بالا لوازمات پورے نہیں کر رہے کیا وہ فرضِ عین کے تارک ہیں؟ بنابریں گناہ کبیرہ کے مرتکب ہیں؟

۳) آپ کے بیان کردہ لوازمات پر صرف اڑھائی تین ہزار رفقائے تنظیم ہی پورے اترتے ہیں۔ باقی سوا ارب مسلمان جو مسلسل فرضِ عین کو ترک کئے ہوئے ہیں' رفقائے تنظیم کو ان کے ساتھ کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہئے' بالخصوص ایسے رشتہ دار' اقرباء اور واقف کار جن پر مندرجہ بالا فکر کو بھی واضح کر چکے ہوں؟

۴) وہ شخص جو پہلے اقامت دین کی جدوجہد کے فرضِ عین ہونے اور سمع وطاعت فی المعروف والی جماعت میں شامل ہونے کو فرضِ عین نہ سمجھتا ہو' آپ نے یا رفقائے تنظیم نے تبلیغ کے ذریعہ اس پر واضح کر دیا لیکن پھر بھی وہ اسے فرضِ عین ماننے سے انکاری ہے' کیا ایسے منکر فرضِ عین کو آپ دائرۂ اسلام سے خارج سمجھیں گے یا نہیں؟ دونوں شکلوں میں دلیل دیجئے!

۵) کیا رفقائے تنظیم کو ایسے ائمہ کے پیچھے نماز پڑھنی چاہئے جنہیں وہ فرضِ عین کا تارک سمجھ رہے ہوں اور ان پر واضح بھی نہ کر رہے ہوں کہ ہم آپ کے پیچھے اگر نماز پڑھ رہے ہیں تو بالاکراہ پڑھ رہے ہیں' کیونکہ آپ کسی ایسی جماعت میں نہیں ہیں جس کا نظم بیعت سمع و طاعت فی المعروف پر مبنی ہو؟ اگر وہ آپ کے مندرجہ بالا لوازمات کو جاننے کے بعد نہ مانے تو کیا پھر بھی اس کے پیچھے نماز پڑھنی چاہئے؟ جبکہ اس انکار پر وہ فرضِ عین کا تارک قرار پائے گا۔

امید ہے آپ جواب سے مطلع فرمائیں گے۔

والسلام

ایک طالبِ حق

جواب

محترمی و مکرمی ــــــ وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاجِ گرامی

میرے ''فکر کا صغریٰ کبریٰ'' جو آپ نے تین نکات کی صورت میں بیان کیا ہے' ان میں سے پہلے دو تو صد فی صد درست ہیں' البتہ تیسرے کے بارے میں میں بارہا وضاحت کر چکا ہوں کہ اقامتِ دین کی جدوجہد کے لئے جماعت سازی کے ضمن میں خود تو ''منصوص'

مسنون اور ماثور'' بیعت سمع و طاعت فی المعروف کو ترجیح دیتا ہوں' البتہ کسی دستوری بیعت کو بھی مباح سمجھتا ہوں۔

رہے آپ کے سوالات تو ان کے ضمن میں بنیادی اور اہم ترین بات یہ ہے کہ میری ساری گفتگو ''اسلام'' کی سطح پر نہیں بلکہ ''ایمان'' کی سطح پر ہوتی ہے ـــــ ایمان اور اسلام کے مابین فرق کو واضح کرنے کے لئے ہی حضرت جبریل آنحضورﷺ کی خدمت میں آئے تھے ـــــ اور حدیث جبریلؑ کی ایک روایت کے مطابق آنحضورﷺ نے فرمایا تھا کہ ((هٰذَا جِبْرِيْلُ اَرَادَ اَنْ تَعَلَّمُوْا اِذْ لَمْ تَسْأَلُوْا)) (مسلم) حالانکہ یہ واضح ہے کہ اس میں سوائے ''احسان'' کی تعریف کے کوئی بات نئی نہ تھی ـــــ پہلی دونوں چیزیں صحابہ کرام کے علم میں تھیں ـــــ البتہ ان کا بیک وقت تقابل جس طرح سورۃ الحجرات کی آیات ۱۴'۱۵ میں ہوا ہے' اسی طرح کا تقابل یہاں تلقین کیا گیا ہے ـــــ بدقسمتی سے ہمارے قرونِ اولیٰ کے بعد وہ تین چیزیں جو ایک ہی سلسلے کی تین کڑیاں تھیں' تدریجاً مختلف دائروں میں منقسم اور جداگانہ حلقوں کی توجہ کا مرکز بن گئیں ـــــ یعنی ''اسلام'' جس پر مسلمان معاشرے اور ریاست کی شہریت کی بنیاد ہے' علماء کرام اور مفتیان عظام کی توجہ کا مرکز بن گیا ''ایمان'' متکلمین کا میدان قرار پایا اور ''احسان'' صوفیاء کرام کا موضوع بن گیا!

اس تمہید کے بعد عرض ہے کہ اسلام کی اصل بنیاد کلمۂ شہادت یعنی اقرار باللسان پر ہے (اگرچہ فقہاء اس میں تصدیق کا اضافہ کرتے ہیں لیکن اگر اس سے تصدیق باللسان مراد ہے تو وہ تو وہی بات ہوئی' لیکن اگر تصدیق قلبی مراد ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی توثیق یا تردید کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے)۔ اس اسلام کے ارکان وہی پانچ ہیں جن کا ذکر نہ صرف حضرت عبداللہؓ ابن عمرؓ کی مشہور حدیث میں ہے بلکہ خود حدیث جبریلؑ میں بھی ہے ـــــ اعمال کا درجہ اس ضمن میں ثانوی ہے ـــــ اور حضرت امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول کہ کوئی مسلمان گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے بھی دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا' صدفی صد درست ہے ـــــ البتہ میرے نزدیک ''ایمان حقیقی'' میں ان پانچ ارکانِ اسلام پر دو اضافی ''ارکان'' مستزاد ہو جاتے ہیں یعنی ''یقین'' دل میں' اور ''جہاد فی سبیل اللہ'' عمل ہیں! (بحوالۂ آیت نمبر ۱۵' سورۃ الحجرات) ـــــ اور اسی اعتبار سے میں اقامت دین کی جدوجہد کو ''فرضِ عین'' قرار دیتا ہوں' البتہ اس کے تارک کو ہرگز نہ دائرۂ اسلام سے خارج سمجھتا ہوں نہ ہی ''گناہِ کبیرہ'' کا مرتکب خیال کرتا ہوں ـــــ ایسے سب لوگ یا تو غفلت اور غلط فہمی کا شکار ہیں' یا اگر میرے فکر

سے بالکلیہ متفق ہونے کے باوجود عملاً اس سے کنارہ کش ہیں تو ضعفِ ایمان میں مبتلا ہیں یا ''ضعفِ ارادہ'' کے نفسیاتی مرض کے شکار ہیں —— تاہم ایسے سب لوگ بھی دائرہ اسلام میں داخل ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے پیچھے نماز جائز ہے بفحوائے فرمان نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام: ((وَالصَّلَاۃُ وَاجِبَۃٌ عَلَیْکُمْ خَلْفَ کُلِّ مُسْلِمٍ بَرًّا کَانَ اَوْ فَاجِرًا وَاِنْ عَمِلَ الْکَبَائِرَ)) (ابوداؤد)

رفقائے تنظیم کا اپنے اعزہ واقارب کے ساتھ سلوک اس حدیث نبویؐ کی رو سے ہوگا کہ ((لِلْمُسْلِمِ عَلَی الْمُسْلِمِ سِتَّۃٌ))اس لئے کہ جیسے کہ عرض کر چکا ہوں کہ یہ سب دائرۂ اسلام میں داخل وشامل ہیں' اِلّا یہ کہ ان میں سے کوئی دین کی بنیادی باتوں میں سے کسی کا انکار کرے یا اس سے کوئی ایسا عمل ظاہر و باہر طور پر سرزد ہو جو ''کفر بواح'' یا ''شرکِ جلی'' کا آئینہ دار ہو' مثلاً کسی بُت کو سجدہ کر لینا وغیرہ وغیرہ۔

یہ بھی واضح رہنا چاہئے کہ کسی مدعیٔ اسلام کو کافر یا غیر مسلم یا دائرۂ اسلام سے خارج قرار دینا یا تو اسلامی حکومت کا کام ہے یا اس کی عدم موجودگی میں مفتیانِ کرام اور فقہائے عظام کا کام ہے' اور وہ بھی ''قضا'' کے جملہ تقاضے پورے کرنے کے بعد! —— یہ کام انفرادی طور پر بڑے سے بڑا شخص بھی نہیں کر سکتا۔

امید ہے کہ میری ان وضاحتوں سے آپ کی اور آپ کے رفقاء کی بھی تسلی ہو جائے گی —— اور ایسے دوسرے حضرات کو بھی اطمینان ہو جائے گا جو بعض اوقات میری خطیبانہ شدت کی بنا پر مغالطوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں —— فقط والسّلام

خاکسار

اسرار احمد عفی عنہ

ڈاکٹر اسرار احمد کی مقبول عام تالیف

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

خود پڑھئے اور دوستوں اور عزیزوں کو تحفتاً پیش کیجئے!

دورانِ ماہِ رمضان اہل وعیال اور عزہ واقارب کے ساتھ اجتماعی مطالعہ کیجئے!

اشاعت خاص : 20 روپے   اشاعت عام : 10 روپے

جدید دنیائے اسلام

قسط وار سلسلہ (14)

برکینا فاسو

تحقیق و تحریر: سید قاسم محمود

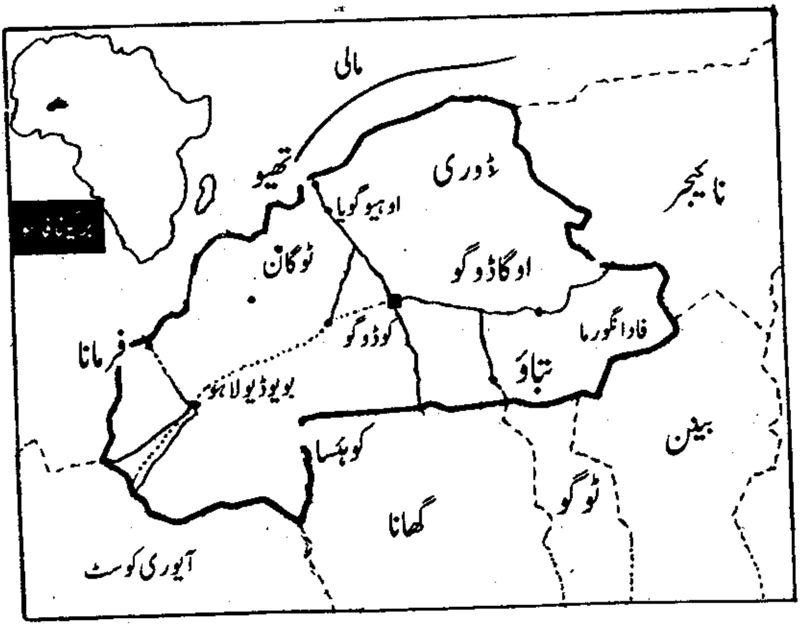

برکینافاسو : ایک نظر میں

پرانا نام: اپر وولٹا

صدر: بلاز کمپارے (1987ء)

وزیراعظم: پاراما نگارنسٹ یونلی

رقبہ: 2لاکھ 74ہزار 200مربع کلومیٹر

آبادی: ایک کروڑ 32لاکھ

شرح پیدائش: 44افراد فی ہزار

شرح افزائش: 2.85فیصد

شرح امواتِ اطفال: 108فی ہزار

گنجانی آبادی: 109فی مربع میل

دارالحکومت: اوگاڈوگو آبادی تقریباً پانچ لاکھ

کرنسی: فرانک۔100 سینٹ

مذہب: مسلمان 60فیصد' عیسائی 10 فیصد' باقی لامذہب

زبانیں: فرانسیسی' قبائلی بولیاں

نسلیں: موسّی' لوبی' بوبو' مانڈی' فلانی

شرح خواندگی: 36فیصد

مجموعی قومی پیداوار: 12.8ارب ڈالر

فی کس آمدنی: ایک ہزار 40ڈالر

شرح افزائش: 4.7فیصد

افراطِ زر: 3.5فیصد

قابل کاشت رقبہ: 13فیصد

زراعت : مونگ پھلی' کپاس' جوار' باجرہ' چاول' مویشی

صنعت: زرعی آلات' چھوٹی مشینری' صابن' سگریٹ' سوتی کپڑا

قدرتی وسائل : مینگانیز' سنگ مرمر' جست' بوکسائٹ' فاسفیٹ' سونا

برآمدات: 265ملین ڈالر' کپاس' سونا

درآمدات: مشینری' اشیائے خوردنی' اشیائے صرف' پٹرولیم' موٹر گاڑیاں

تجارتی ساتھی: آیوری کوسٹ' فرانس' اٹلی' مالی' ٹوگو' نائجریا

بُرکینا فاسو

اسلامی سربراہ تنظیم (او آئی سی) کا یہ ملک براعظم افریقہ میں چاروں طرف سے خشکی سے گھرا ہوا ہے۔ اس کے شمال مغرب میں مالی' شمال مشرق میں نائجر' جنوب مشرق میں بنین' جنوب میں ٹوگو' گھانا اور آیوری کوسٹ ہیں۔

مجموعی طور پر بُرکینا فاسو (سابق اپر وولٹا) سطح مرتفع ہے جس کی بلندی سطح سمندر سے 250تا350 میٹر ہے۔ سب سے اونچا علاقہ شمال مشرق میں ہے جس کی بلندی سطح سمندر سے 500 میٹر ہے۔ ملک کی عام ڈھلان شمال سے جنوب کی طرف ہے۔ مشرق سے مغرب کی جانب

بالترتیب سفید وولٹا' سرخ وولٹا اور سیاہ وولٹا اس ملک کی خاص ندیاں ہیں۔ یہ ندیاں شمال سے جنوب کی طرف بہتی ہوئی ٹوگو اور گھانا سے گزر کر اپنا پانی خلیج گنی میں گراتی ہیں۔

بُرکینا فاسو کی آبادی کی گنجائش پر یہاں کے جغرافیائی حالات اور آب و ہوا کا گہرا اثر ہے۔ شمال مغربی نیم خشک علاقے اور مشرق کے دلدلی نشیبی علاقوں میں بہت کم لوگ آباد ہیں۔ ملک کے وسطی علاقے زرخیز ہیں اور بیشتر آبادی اسی علاقے میں رہتی ہے۔ یہاں سے ہر سال بہت سے مزدور روزگار کی تلاش میں پڑوسی ممالک میں چلے جاتے ہیں۔ شمال مشرقی علاقہ سوانا گھاس کے میدانوں سے ڈھکا رہا ہے۔ اس علاقے کا خاص وسیلۂ روزگار مویشی پالنا اور بھیڑ بکریاں چرانا ہے۔

''بُرکینا فاسو'' دراصل اپر وولٹا کا نیا نام ہے۔ یہ نام 4راگست 1984ء کو سابق صدر کیپٹن تھامس سنکارا کی حکومت کی پہلی سالگرہ کے موقع پر رکھا گیا۔ ''اپر وولٹا'' کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ دریائے وولٹا کے دو خاص معاون دریاؤں کے منبع اس ملک میں ہیں' جبکہ بُرکینا فاسو کے لغوی معنی ہیں دیانت دار لوگ اور اُن کی اپنی سرزمین' ان کی اپنی عوامی حکومت۔

چودھویں صدی عیسوی میں یہ ملک مالی کی اسلامی سلطنت کا حصہ تھا۔ اس سے پہلے کے حالات دستیاب نہیں ہیں۔ مالی کے بعد یہ صنغائی کی اسلامی سلطنت کا حصہ بن گیا۔

زمانۂ قدیم میں اس علاقے پر موسّی قبیلے کی حکومت تھی۔ آج بھی یہ برکینا فاسو کا سب سے بڑا قبیلہ ہے۔ یہ قبیلہ سترہویں صدی میں مشرقی افریقہ سے نقل مکانی کر کے یہاں وارد ہوا۔ انہوں نے اس علاقے میں تین آزاد سلطنتوں کی بنیاد رکھی' جن میں سے ایک ''گیمباگا'' میں تھی' جس کا موجودہ نام گھانا ہے۔ اوگاڈوگو (موجودہ دارالحکومت) کی سلطنت سب سے طاقتور تھی۔

جب پورے مغربی افریقہ میں اسلام پھیل چکا تھا' تب بھی موسّی قبائل اسلام نہ لائے اور اسلامی سلطنت میں لامذہب ہی رہے۔ ان کا بادشاہ ''مورونابا'' کہلاتا تھا' جس کا مطلب ہے ''ہماری زمین کا آفتاب''۔ پہلے اس کا دارالحکومت ٹنکوڈوگو تھا اور اس کے بعد اوگاڈوگو۔

اٹھارہویں صدی میں موسّی قبائل نے پڑوسی اسلامی سلطنتوں یعنی مالی اور صنغائی سے مسلسل جنگیں جاری رکھیں۔ مسلمانوں سے پے در پے شکستوں کے نتیجے میں یہ قبائل سکڑتے گئے' یہاں تک کہ صرف شہر اوگاڈوگو میں محصور ہو کر رہ گئے۔

1896ء۔ بالآخر فرانس نے اس علاقے پر قبضہ کر کے اپنا انتداب قائم کیا۔

1904ء۔ فرانس نے اپنی ایک نوآبادی ''اپر سینگال و نائجر'' قائم کی۔ اپر وولٹا اس نوآبادی کا ایک حصہ تھا۔

1919ء۔ اپر وولٹا کو اس نوآبادی سے الگ کر کے ایک علیحدہ فرانسیسی کالونی بنایا جاتا ہے۔

1932ء۔ اپر وولٹا کے حصے بخرے کر کے اسے فرانسیسی سوڈان' نائجر اور آیوری کوسٹ میں

تقسیم کردیا جاتا ہے۔(بعد میں 1947ء میں پھر متحد کردیا جاتا ہے)

1958ء۔ فرانس کے زیر سایہ اندرونی خود مختاری دے دی گئی اور اس کا نام ''وولٹیگ جمہوریہ'' رکھا گیا۔

1959ء۔ عام انتخابات میں فرانس کی ہم نوا سیاسی جماعت ''افریقن ڈیموکریٹک ریلی'' بھاری اکثریت سے کامیاب ہوگئی اوراس کے قائد مورس یامیوگووزیراعظم منتخب ہوئے۔اب جمہوریہ کا نام ''اپرووولٹا'' رکھا گیا۔

1960ء۔اپرووولٹا کوفرانس سے آزادی ملتی ہے۔مورس یامیوصدرمملکت بنتے ہیں۔

1966ء۔آرمی چیف آف سٹاف لیفٹیننٹ کرنل الحاج سینگولے نے صدریامیوگوکی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔اقتصادی صورت حال میں بہتری ہوئی۔

1970ء۔عام انتخابات ہوئے اور نیا آئین بنایا گیا۔

1972ء۔آئینی حکومت بحال ہوئی۔

1974ء۔صدرمملکت الحاج سینگولے نے آئین منسوخ کردیا۔وزیراعظم کا عہدہ ختم کردیا۔ اسمبلی توڑدی اورصدرکی حیثیت سے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے۔

1976ء۔صدرسینگولے نے فوجی حکومت کا خاتمہ کرکے نئی حکومت بنائی' جس کے ارکان زیادہ تر ''سول حلقوں'' سے لئے گئے تھے۔

1977ء۔سیاسی جماعتوں پرساڑھے تین سال کے لئے پابندی عائدکردی گئی اورایک نئے آئین کا اعلان کیا گیا' جس کے تحت نئے انتخابات ہوتے ہیں۔لوگ فوجی حکومت کے خلاف اورسول حکومت کے حق میں ووٹ ڈالتے ہیں۔

1978ء۔ بارہ سالہ فوجی حکومت ختم ہوتی ہے۔صدرسینگولے دوبارہ صدرمملکت منتخب ہوتے ہیں۔

1979ء۔نیشنل اسمبلی سہ جماعتی نظام قائم کرتی ہے۔

1980ء۔نومبر میں کرنل سائے زربو' پرامن فوجی انقلاب کے ذریعے صدرسینگولے کا تختہ اُلٹ دیتے ہیں اورقومی ترقی کے وعدوں پراقتدارمیں آتے ہیں۔

1981ء۔کرنل زربونئے وزیراعظم بنتے ہیں' جواقتصادی منصوبہ بندی اورزرعی اصلاحات کا اعلان کرتے ہیں۔

1982ء۔میجراوڈراؤگونے کرنل زربوکاتختہ الٹ کراقتدارخودسنبھال لیا' لیکن اصل اور بڑا انقلاب 1983ء میں آیا' جب 33 سالہ فلائٹ کمانڈرکیپٹن تھامس سنکارانے میجرصاحب کوہٹا کر حکومت کانظم ونسق سنبھالا۔سنکاراکمیونسٹ تھا۔اُس کے عہد میں 1984ء میں اپرووولٹا کا نام تبدیل کر

کے ''برکینا فاسو'' رکھا گیا' کیونکہ اپر وولٹ کا نام فرانسیسی استعمار کی علامت تھا۔ نئے نام نے قومی امنگوں کی ترجمانی کی اور افریقہ کے پانچویں غریب ترین ملک نے رفتہ رفتہ سیاسی شعور حاصل کیا۔

کیپٹن سنکارا کی حکومت کو شدید اختلافات کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ مارچ 1984ء میں اساتذہ کی یونین نے ہڑتال کر دی تھی۔ حکومت نے اکثر ہڑتالیوں کو ملازمت سے برطرف کر دیا' جس پر شورش بڑھ گئی۔ اسی طرح مئی 1985ء میں حکومت کے خلاف فوجی افسروں کی ایک سازش پکڑی گئی' جن میں سے سات افسروں کو کورٹ مارشل کر کے پھانسی دے دی گئی۔ فرانس کو بھی نئی حکومت کے خلاف تشویش لاحق رہی کہ کہیں برکینا فاسو کے ''اشتراکی انقلابی خیالات'' آیوری کوسٹ اور آس پاس کے دوسرے فرانسیسی دوست ممالک میں داخل نہ ہوں۔ اسی لئے فرانس کیپٹن سنکارا کو امداد کی پیشکش کرتا رہتا ہے' لیکن کیپٹن سنکارا اپنے عوام کو تلقین کرتے رہتے ہیں کہ آزادی کی خاطر ہمیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہئے' بیرونی امداد سے آزادی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

تعلیم اور صحت کے شعبوں میں بے شک اصلاحات اور ترقیاں ہوئیں' لیکن بیرونی سرمایہ کاری نہ ہونے کی وجہ سے کاروبار اور کارخانے تباہ ہو گئے۔ اکثر تاجر حضرات ملک چھوڑ کر پڑوسی ملکوں میں چلے گئے۔ صنعتی مزدوروں نے یونین بنا کر ہڑتالیں شروع کر دیں۔ 15 /اکتوبر 1987ء کو ناراض فوجیوں نے' جو چند ماہ پہلے تک وفادار تھے' سنکارا کو قتل کر دیا۔ اُس کی جگہ اس کا قریبی دوست بلاز کمپارے صدر بنا۔ صدر کمپارے نے سنکارا کی اچھی اصلاحات کو برقرار رکھا اور غلط منصوبوں کو ختم کیا۔ 1991ء میں اُس نے عالمی بنک کی اقتصادی تجاویز کو قبول کیا۔ ایک نیا آئین بنا کر نافذ کیا۔ 1991ء میں' اور پھر 2000ء میں انتخابات ہوئے' جس کا حزبِ اختلاف کی جماعتوں نے بائیکاٹ کیا۔ پاراما نگا وزیر اعظم منتخب ہوئے جو آج تک ملک سے غربت دور کرنے کی ناکام کوششیں کر رہے ہیں۔

''مؤتمر عالمِ اسلامی'' کے ایک تخمینے کے مطابق برکینا فاسو میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً 60 فیصد ہے۔ حالیہ برسوں میں اسلام کی اشاعت زیادہ ہوئی ہے۔ بعض قبائل نے تو صدیوں پہلے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اب لامذہب قبائل بھی اسلام کی طرف مائل ہو رہے ہیں' یہاں تک کہ موسّی قبائل بھی اسلام قبول کر رہے ہیں' اگرچہ دنیا بھر سے عیسائی مبلغ بھی یہاں شدومد سے کام کر رہے ہیں۔

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجئے۔